بلندیوں کے خواب

ایک ناول

حامدی کاشمیری

بلندیوں کے خواب

ایک ناول

حامدی کاشمیری

پبلشرز
ادارۂ ادب بہوری کدل سرینگر کشمیر

میں ریاستی کلچرل اکاڈمی کے ارباب اختیار کا ممنون ہوں، جنہوں نے مالی معاونت فرماکر اس ناول کے اشاعتی کام میں میری مدد کی۔

اس ناول کے تمام کردار، واقعات اور مقامات فرضی ہیں، اور اصل واقعات، مقامات یا کرداروں سے اس کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے۔ جس کے لئے مصنّف یا پبلشر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہو سکتی۔

بار اوّل تعداد ۵۰۰

مطبع . . . . . . سرودر لو ایریٹو پریس

قیمت . . . . . پانچ روپیہ

بادل چنگھاڑتے ہیں، مست ہاتھیوں کی طرح
بجلیاں بستیوں کو خاکستر بنا دیتی ہیں، دھواں اٹھتا ہے
راستے بہہ جاتے ہیں، بادوباراں کے طوفان امنڈتے ہیں
منزلوں کے نشان مٹ جاتے ہیں، گم ہو جاتے ہیں
سیاہ طوفانی راتوں میں برفانی ہوا کے جھکڑ چلتے ہیں
درخت اکھڑ جاتے ہیں، چمن ویران ہوتے ہیں
ویرانیاں ماتم کرتی ہیں، دور دور تک
انسان گھبرا جاتا ہے — سراسیمہ ہو جاتا ہے!
لیکن وہ زندہ رہتا ہے —
وہ زندہ رہتا ہے —
آگے بڑھتا ہے —
وہ تاریکیوں کے امنڈتے ہوئے طوفان میں آگے بڑھتا ہے
اس کی روح کے پردوں میں نئی صبحوں کے اجالے کسمساتے ہیں۔
وہ آگے بڑھتا ہے۔
ازل سے وہ فطرت کی ان اندھی اور تخریبی قوتوں سے ٹکراتا رہا۔
وہ ابد تک ٹکراتا رہے گا۔

(ایک نظم)

انتساب

ان عورتوں اور مردوں کے نام جنھیں میں نے قریب سے دیکھا، اور جو میرے ناول کے کردار بن گئے!

حامدی کاشمیری

•

برسوں پہلے کی بات ہے۔

صبح کی ہلکی سی، ملگجی روشنی بھیگی ہوئی فضاؤں میں دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی، رات اپنی بھیگی بھیگی سرمئی زلفیں سمیٹ رہی تھی، ان زلفوں سے کانپتے ہوئے شبنمی سائے اب بھی بین روڈ سے بھاگتے ہوئے ہوٹل کے رنگین دریچوں اور منقش دیواروں سے گلے مل رہے تھے، روشنی اور سائے ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہے تھے، بس سروس کے سامنے ایک دو گھنٹے پہلے کا جاگا ہوا شور وغل، رونق اور گہما گہمی اب ماند پڑنے لگی تھی، کیونکہ سامنے کھلی پختہ سڑک کے کنارے بسوں میں مسافر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ چکے تھے، قلیوں نے بڑی سرگرمی سے سامان وغیرہ بسوں کی چھتوں پر لاد دیا تھا، بس سروس کا عملہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد کمروں میں واپس جا چکا تھا، ایک نوعمر کیلے والا اب بھی بسوں کا طواف کر رہا تھا، فٹ پاتھ پر دو سنگترے والے آوازیں دے رہے تھے، کچھ قلی بسوں کی کھڑکیوں سے چمٹ کر چند مسافروں سے جھگڑ رہے تھے اور چیخ چیخ کر، گڑگڑا کر ایک دو آنے اور مانگ رہے تھے، ان میں اکثر قلی سری نگر یا وادی کے

کسی نہ کسی دور افتادہ حصے سے آئے ہوئے تھے، زیادہ تر ان میں دیہاتی لوگ ہوتے ہیں، جو سردیوں میں بانہال کو پار کر کے میدانی علاقوں میں مزدوری کرنے آتے ہیں، اور پیٹ کاٹ کر گذارہ کرتے ہیں!

"یہ لوگ کہاں پیچھا چھوڑیں گے؟" پنڈت جی نفرت سے بولے، لیکن ان کا لہجہ مدھم تھا، انہوں نے سردی سے بچنے کے لئے سر سے نیچے تک گرم لوئی لپیٹ لی تھی، چونکہ سڑک پر غضب کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اس لئے سب لوگ پہلے ہی سیٹوں پر بیٹھ گئے تھے، پنڈت جی تو سب سے پہلے اپنی سیٹ پر دم سادھے بیٹھے تھے۔ یہ وہی پنڈت جی تھے، جو ابھی ابھی کسی قریبی رشتہ دار سے ایک دلچسپ بحث میں الجھے ہوئے تھے، ان کا بھولی صورت والا رشتہ دار کہ وہ دس بیس روپیہ اور ساتھ لیتے جائیں، اور ادھر پنڈت جی انہیں بڑے نرم لہجے میں سمجھا رہے تھے، کہ ان کے پاس ضرورت کے مطابق روپیہ موجود ہے، دن بھر ہی کا تو سفر ہے۔ شام کو تبھی گھر پر ہوں گے، زیادہ روپیہ ساتھ لے جانے میں کونسی تک ہے؟

"یہ مزدور بھی کیا مصیبت ہیں، جھپٹ جاتے ہیں، بری لت پڑ گئی ہے انھیں ـــ" ساتھ بیٹھے ہوئے فربہ اندام سردار جی ناک سکیڑ کر بولے "بھئی ڈرائیور کو کہاں نیند آ گئی ـــ؟" پیچھے سے ایک آواز آئی۔

"پہلے ہی دیر کر دی ہے ـــ" ایک نوجوان بولا "پنڈت جی آپ ذرا ہارن کھینچئے ـــ"

پنڈت جی نے سنی ان سنی کردی، اور میری طرف منہ پھیر کر بولے۔

"کیا وقت آیا جناب؟"

میں وقت دیکھنے کے لئے بادل نخواستہ پتلون کی جیب سے بایاں ہاتھ نکال ہی رہا تھا کہ سامنے روگناتھ بازار سے ایک چمکتی ہوئی سیاہ رنگ کی ٹیکسی آئی۔ ٹیکسی ہماری بس کے قریب رکی اور چند لمحوں میں ٹیکسی کی عقبی سیٹوں سے تین لڑکیاں اتریں، اور فرنٹ سیٹ سے دو نوجوان ---- ہٹے کٹے، خوش پوش، خوش شکل، پہلی لڑکی تنگ اور چست پتلون پہنے ہوئے تھی، اس کے بدن پر سرخ رنگ کی سوئٹر بھلی لگتی تھی، اس کے بال خوبصورت انداز میں جدید فیشن کے مطابق گندھے ہوئے تھے، وہ تینوں میں نسبتاً کم عمر لگتی تھی، دوسری لڑکی اکہرے بدن کی تھی، نازک سی، شاخ سنبل کی طرح لچکتی ہوئی، اس نے سکرٹ پہن رکھا تھا، اور اس کی نازک خوبصورت سی ٹانگیں گھٹنوں سمیت عریاں تھیں، اور تیسری لڑکی، جو لڑکی سے زیادہ عورت دکھائی دے رہی تھی، سنہری رنگ کی ساڑھی میں لپٹی ہوئی تھی، اس کے بال کھلے تھے شانوں پر لہراتے ہوئے شبنم آلود، تینوں ابھی ابھی نہا کر آئی ہیں۔ میں سوچنے لگا ان کے بالوں کی تازہ خوشبو کی لپٹیں دور تک پھیل گئیں، وہ تول تول کر قدم اٹھانے لگیں، ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے آسمان سے کہکشاں زمین پر اتر آئی ہے۔ میرے خیالوں میں

کئی رنگ بکھر گئے!

"سیاح لوگ ہیں شاید" دوشالہ اوڑھے ہوئے ایک خواجہ صاحب بولے، یہ وہی بزرگ آدمی تھے، جو آفس میں ٹکٹ بابو سے خوامخواہ الجھ پڑے تھے۔

"بادشاہو، دیکھ لینا یہ لوگ برف اور جاڑے میں جم کر رہ جائیں گے" سردار جی خاموش نہ بیٹھ سکے۔

"کیا کہہ رہے ہیں سردار جی!" نوجوان زور سے بولا "جاڑے کی مصیبتیں ہمارے لئے ہیں، لکھ پتی لوگ جاڑے میں بھی عیش کرتے ہیں۔ اور ابھی تو جاڑے کا موسم دور ہے بہت۔"

"سچی بات ہے" پنڈت جی نے فوراً تائید کی۔

وہ لوگ دوسری بس میں سوار ہو چکے تھے۔ اتنے میں ہماری بس کے ڈرائیور نے اپنی سیٹ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولی، اور اپنی سیٹ پر براجمان ہوا۔

"سب بیٹھ گئے ؟" ڈرائیور نے اوور کوٹ کے میلے سے کالر سے گردن چھپالی،

"جی ہاں، چلو جی ـــــ" پچھلی سیٹ سے کنڈکٹر کی آواز آئی، لوگ ایک دوسرے کی طرف اطمینان سے دیکھنے لگے۔ اور بس سٹارٹ ہوئی۔

بس رکھناتھ بازار سے بھاگی جارہی تھی، تیرتھوں کے اس شہر کے سب سے بڑے بازار میں سے، اس بازار میں دن میں اور

شام گئے تک گہما گہمی، رونق اور رنگینی رہتی ہے۔ یہ بازار ایک سنگم ہے، جہاں قسم قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ مختلف قسم کے لباس پہنے ہوئے بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے، یہاں کاروباری لوگ، سیّاح پیر وفقیر، جرنلسٹ، سیاستداں، لیڈر، شاعر، ادیب، آوارہ گرد، شرفا، سبھی نظر آتے ہیں۔ رات کو قمقموں کی جگمگاتی روشنی میں یہاں حسن نکھرتا ہے۔ اور عشق بہک جاتا ہے ـــــــ!

اس وقت یہ بازار خاموش تھا، خاموش، بے حس، نیندوں میں کھویا کھویا سا، دور خوابوں کے بھیگے بھیگے دھندلکے چھا رہے تھے!

"یہ عجائب گھر ہے!"

نوجوانوں کی آواز آئی، بس پر گمبھیر خاموشی چھا گئی تھی؛ سب لوگ گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے خاموش بیٹھے تھے۔ اندر بس کی کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر دیکھ رہے تھے۔ شاید جانے والوں کے اس شہر کو آخری سلام پیش کر رہے تھے۔ نوجوانوں کی آواز سن کر سب چونک سے پڑے۔

"ویسا ہی عجائب گھر ہوگا، جیسا ہر نگر میں ہے" پیچھے سے ایک نئی آواز سنائی دی، بے وجہ حیرت میں ڈوبی ہوئی، پتلی سی استفہامیہ آواز، میں نے پلٹ کر دیکھا، وہی تو ہے، پرانا سا جگر پہنے ہوئے کالی ٹوپی اوڑھے ہوئے، مضبوط اور لمبوترے جسم کا، مرجھایا چہرے

سکا، پینتیس، چھتیس سال کا آدمی، خاص سرینگر کا رہنے والا، جو کل ٹکٹ گھر میں مجھے ملا تھا، مضبوط اور سخت جسم والا آدمی۔ لیکن جس کی آواز پتلی تھی، آکھو کھلی، بے رس سی ـــــ سرینگر کے وسط میں اس کی دکان تھی، ڈرائی کلینر کی دکان، پہلی ہی ملاقات میں اس نے انکشاف کیا کہ وہ پہلی بار گھر سے نکلا ہے اور جموں میں ایک دکان کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے، ایک دوست کو شریک بنا کر لگے ہاتھوں وہ بھی دیکھ آیا تھا۔ وہ اب بیس پچیس دنوں کے بعد سرینگر جا رہا تھا۔

کسی نے اس پر مزید بات نہ کی سب خاموش رہے، اور اپنے اپنے خیالوں میں گم!

جب ایک عرصہ کے بعد انسان اپنے وطن کی فضاؤں میں جا رہا ہو، اپنے گھر لوٹ رہا ہو اپنے عزیزوں سے ملنے جا رہا ہو ـــــ دل میں امنگوں اور آرزوؤں کا ارتعاش لیے، پلکوں پر خوابوں کے دیئے جلائے، دل کی ہر دھڑکن میں گداز سموئے ہوئے تو خاموش رہنے میں کتنا لطف آتا ہے۔ خاموشی، خیالوں کی قوت پرواز عطا کرتی ہے۔ داخلیت کے آئینے میں آرزوں کے خد و خال نکھرتے ہیں، خاموشی میں انسان زمان و مکان کی حدوں کو پھاند کر آگے نکل جاتا ہے، آگے ہی آگے، اور آگے، ـــــ اور

پریڈ گراونڈ کے قریب بس ایک دھچکے کے ساتھ رکی

"بھرلوجی، بھرلوجی سواری ـــــ ڈرائیور نے پلٹ کر

دیکھا' وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ پکے ہوئے بال، چہرے پر زرد لکیروں کے جال بُنے ہوئے موٹے موٹے سیاہی مائل ہونٹ، چہرے کا رنگ بھی سیاہ، سر پر خاکی رنگ کی بڑی سی پگڑی، شکل و صورت، لب و لہجہ اور لباس اعلان کر رہا تھا کہ وہ جموں کا رہنے والا ہے ——— جموں ڈوگرہ اور پہاڑی لوگوں کی بستی جو ہمالیہ کے ایک چھوٹے سے سلسلہ پر آباد ہے اس کے ایک طرف پیر پنجال سینہ ابھارے ہوئے ہے اور اس کے دامن میں، پنجاب کے شہر میر اور رومان پرور میدان آرام کرتے ہیں ——— آج صدیوں پہلے جب راجہ جامبو لوچن کا اس پہاڑ سے گذر ہوا، تو وہاں صرف ویرانے ہی ویرانے تھے، تپتے ہوئے ویرانے جنگل ہی جنگل ——— اور راجہ کی متجسس نگاہوں نے ایک چشمے پر ایک حیرت انگیز نظارہ دیکھا، شیر اور بکری دونوں ایک ہی گھاٹ اپنی پیاس بجھا رہے تھے، راجہ کی حیرت کی حد نہ رہی وہ دیکھتا ہی رہا۔ اس ویرانے کے تقدس اور عظمت کے آگے اس کی جبیں دل جھک گئی۔ اس نے فرمان جاری کیا کہ اس ویرانے کو آباد کیا جائے، ویرانے آباد ہو گئے! اور اس چٹانوں اور پتھر دل کے شہر کا نام جموں پڑ گیا، راجہ جموال کے نام پر، پتھر دل کا یہ شہر صاف ستھرا شہر ہے۔ یہاں کے لوگ سیدھے سادھے ہیں، محنتی ہیں، پرانے خیالات اور روایات کے پابند، جذباتی انسان اپنے عقیدوں پر سر مٹنے والے، بھروپ انسان ——— ! لیکن یہاں کے لوگ ذکی الحس بھی ہیں، فکر و فن کے پرستار، ......

ہندوستان کی کلاسیکل موسیقی میں تھروں کے اس شہر کے پہاڑی راگ ایک مستقل اور اہم اضافہ ہیں، ان راگوں میں روح کی سرمستیاں ہیں، سوز و گداز ہے اور حسن ہے! جب یہاں کے لوگ رقص و موسیقی کی نقرائی لہروں میں بہہ جاتے ہیں، تو تھروں کا یہ شہر نرم نوابوں کا شہرستان بن جاتا ہے ——!!

یہاں کے لوگ فن تعمیر میں برسوں سے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتے آئے ہیں۔ بالو اور کمرمچی نے فن تعمیر میں ابدی حسن بھر دیا۔ یہاں کے مندروں کی دلآویزی اور حسن کاری دیکھ کر ہمیں جگن ناتھ پوری اور مدراس کے مندروں کی یاد آتی ہے —— اور جب جون جولائی میں یہاں کی چٹانیں اور تھر دھوپ سے تپ جاتے ہیں، گرمی کی شدت سے دھرتی سیاہ پڑ جاتی ہے، جب آفتاب کی تمازت سے انسان جھلس جاتے ہیں، سارا شہر دہک اٹھتا ہے۔ تو تھروں کا یہ شہر جہنم زار بن جاتا ہے۔ لوگ پیٹ کی مجبوری سے چھپ چھپ کر گھروں سے نکلتے ہیں۔ پسینے میں شرابور، ہراساں، پریشان —— اور جب شام کو سورج ڈھلنے لگتا ہے۔ تو انسان سکون محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وہ مکان کی تپتی ہوئی فضاؤں سے نکل کر شام کے سنہری ہالوں میں توی کے رتیلے کناروں پر آنکلتے ہیں ——

یہ توی کا شہر ہے!

پہاڑوں کی ڈھلوان پر بسے ہوئے اس شہر کے دامن میں توی

کا بل کھاتا ہوا، حسین، خوشرنگ اور ٹھنڈے پانی کا مستانہ خرام دریا رواں ہے!

شام ہونے تک اِن کناروں پر روح انسان سکون اور راحت کی ایک نئی دنیا آباد کرتی ہے، دل کے دبے ہوئے ولولے جاگ پڑتے ہیں، ارمانوں کے جھلسے ہوئے پھول تازہ ہوتے ہیں، نگاہ شوق کو اپنی رعنائی اور جمال واپس مل جاتا ہے، اور آرزو کی دھڑکنیں دور دور تک رنگوں کی پھوار برساتی ہیں ـــــــ اس شفق رنگ فضا میں نسوانی حسن کے خاموش یاقوتی ہونٹوں پر شیریں زمزمے حرکت میں آتے ہیں، گلاب کھلتے ہیں، عورتوں کے سانولے جسموں کی خوشبوئیں مچلتی ہیں، شام کے شفق زاروں میں حسن و عشق کے عشرت کدے سنورتے ہیں۔ ڈوگری لوگ گیتوں کی تانوں سے توی کی مستانہ خرام لہروں میں سونا پگھل جاتا ہے۔ سائے رنگوں میں ڈوب جاتے ہیں، جوان عورتوں کے گدرائے ہوئے جسموں کے حسین خطوط میں کنول جلتے ہیں۔ ہونٹوں کی شراب چھلکتی ہے اور نگاہیں بہک جاتی ہیں ـــــــ

"چلو جی ـــــــ" کنڈاکٹر نے آواز دی۔

"ٹھیک ہے؟" ڈرائیور نے گردن پیچھے کی طرف موڑے بغیر ہی پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے!"

میں باہر دیکھ رہا تھا، پریڈ گراؤنڈ کی سڑک پر بہت سی گاڑیاں تیار کھڑی تھیں، سری نگر جانے کے لئے میل بسیں،

پرائیویٹ سروسز والوں کی بسیں، اے کلاس اور بی کلاس کی بسیں، مال گاڑیاں، ابھی ہماری بس کو رکے ہوئے چند منٹ بھی نہ گذرے تھے کہ پیچھے سے ایک اور بس آئی وہ بھی رک گئی، شاید اس میں بھی کچھ اور سواریاں بھری تھیں، اس میں شاید وہ خوبصورت عورتیں اور مرد بھی تھے جو نہ جانے کس دور افتادہ علاقے سے کشمیر کے نظاروں کا لطف اٹھانے آئے تھے، شاید اسی بس میں انور صاحب بھی تھے، وادی کے مشہور شاعر عوام کی دھڑکنوں میں بسے ہوئے نغمہ نگار، وہ مشاعرے میں شرکت کر چکے تھے، کل شام کو ہماری ملاقات ہوٹل میں ہوئی تھی، کشمیری زبان کا یہ مشہور شاعر حبہ اور میر کی طرح عشق و محبت کے جذبات سے دھڑکتی ہوئی غزلیں تخلیق کرتا ہے، اس نے آغاز شباب میں رندی اور عشق بازی کے خوب گیت گائے ہیں، یاقوتی ہونٹوں، سیکدہ بردوش لگا ہوں گلاب جیسے رخساروں، چھاتی پر کھلے ہوئے انار کے پھولوں اور مہکتے ہوئے شگوں گیسوؤں کے سحر کار نغمے الاپے ہیں۔ اور آج یہ شاعر رومان اچانک تصوف کر کے خارزاروں میں الجھ کر رہ گیا ہے، انور صاحب کا زیارت کعبہ شریف سے لوٹنا تھا کہ وہ اچانک بدل گئے ہو سکتا ہے یہ ان کے فکری اور ذہنی ارتقاء کی ایک نئی منزل ہو ——!

"پرانی شاعری سناتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے!" وہ ایک دو بار مجھے شرمسار لہجے میں کہہ چکے تھے، اور ساتھ ہی حافظ کا یہ شعر بھی سنا چکے ۔۔

۰۔ چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
رندی و ہوسناکی در عہدِ شباب اولے

بس سٹارٹ ہو چکی تھی۔
بسوں کا ایک کارواں روانہ ہو چکا تھا۔

●

بس اب شہر کی حدود سے آگے نکل چکی تھی، اور پہاڑی راستوں پر بھاگ رہی تھی، صبح کی خنک روشنی دائیں جانب پہاڑوں کے اوپر سے پھوٹ رہی تھی، دھندلائی ہوئی نرم سی روشنی، آسمان پر دبیز بادلوں کا ایک شامیانہ سا نصب کیا گیا تھا، پہاڑی راستے کے نیچے ناہموار ڈھلوانوں اور بہت گہری ٹیڑھی کھائیوں میں دھند انگڑائی لے رہی تھی، پہاڑی کی جن چوٹیوں سے دھند چھٹ گئی تھی، وہ بہت صاف نظر آ رہی تھیں، دور دائیں جانب پہاڑوں کی سب سے اونچی چوٹیاں خوابیدہ ابر پاروں سے ہم آغوش تھیں —— خاموش اداس، گھمبیر!

بے حد نظر تک پھیلے ہوئے پہاڑ!

پہاڑوں کے اس لامحدود ویرانے میں انسان کھو جاتا ہے،

وہ اپنی انفرادیت پر شک کرنے لگتا ہے، اور ——

"سالی بارش پھر شروع ہو گئی ——"

ڈرائیور نے اچانک نفرت اور بیزاری سے کہا، جیسے

اپنے آپ سے بڑبڑایا۔

"لگتا ہے اس طرف خوب بارش ہوئی ہے" پنڈت جی آہستہ سے بولے۔

"یہی سرج ہے یہاں کے موسم میں، بارش لگ گئی تو رکتی نہیں" داڑھی کہاں خاموش رہتے،

میں نے غیر ارادی طور پر ان کی طرف دیکھا، ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں جیسے ہلکی سی دھند تیر رہی تھی۔

"یہی حال شملہ کا بھی ہے" سردار جی کے پیچھے ایک گرم سوٹ میں ملبوس شخص بولا۔ اس کی سیٹ کے ساتھ ایک نوجوان عورت بیٹھی تھی، بڑا سا شال اوڑھے ہوئے گٹھری سی بنی ہوئی، اس نے اپنی چھاتی سے بچے کو چمٹا لیا تھا، وہ اس شخص کی بیوی لگتی تھی، شوہر کی گود میں ایک گول سا بچہ سویا ہوا تھا۔ وہ عینک پہنے ہوئے تھا، خد و خال سے کشمیری پنڈت لگتا تھا۔ لیکن ایسا پنڈت جو برسوں وادی سے باہر رہا ہو، سروس یا کسی اور سلسلے میں،

شملے میں بھی ابھی دھوپ نکلتی ہے، ابھی بارش ہوتی ہے۔ کوئی بھروسہ نہیں وہاں کے موسم کا—" وہ کہتا رہا، اور ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک نو عمر سردار صاحب ایک فلمی گیت گنگنا رہے تھے۔

ع یہ رات بڑی متوالی ہے، یہ رات بڑی متوالی

"لیکن یہ کولشا موسم ہے بارشوں کا سمجھ میں نہیں آتا—" خواجہ صاحب

کی چہچہاتی آواز سردار صاحب کے گیت کے بول پر چھا کر رہ گئی۔
میں نے اپنی طرف کھلنے والی کھڑکی کا شیشہ اتار دیا،
اس لئے کہ بارش کے موٹے موٹے قطرے اب اندر لپک رہے تھے، اور
سردی کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی تھی، میں اب ایک شیشے سے باہر
دیکھ رہا تھا۔ اور بارش کے قطرے شیشے سے ٹکرا رہے تھے، سامنے بل
کھاتی ہوئی لہراتی ہوئی سڑک پانی سے بھیگ چکی تھی، بائیں جانب ایک
کہیں پہاڑوں کے دامن کے ساتھ ساتھ تیز پانی ندی کی صورت میں
بہہ رہا تھا۔ چٹانیں بھیگ چکی تھیں، رات بھر خوب پانی برسا ہے، اور
آسمان کی وسعتوں میں یہ بھیانک بادل ــــــــ؟ اگر یہ بادل برس
گئے تو ــــــــ؟
لیکن فکر کا ہے کی ــــــــ؟ دل کی وادیوں سے آواز آئی،
آج شام سے پہلے ہم وادی میں ہوں گے، راستہ خدا کے
فضل سے ٹھیک ہے اور ہم پہاڑوں کی چھاتی سے گزر جائیں
گے، بانہال پار کریں گے، آج کا دن تو گزر جائے گا، شکر ہے
نہ جانے کل ان پہاڑی راستوں کا کیا حال ہو گا ــــــــ؟
کل کی بات کون جانے؟
اور آج ــــــــ؟
آج دن ڈھلے میں سرینگر کی جانی پہچانی سڑک
سے ہو کر اپنے گھر پہنچ جاؤں گا، سرینگر کے وسط میں میرا گھر ہے

پرانی وضع کا تین منزلہ مکان، جسکی دیواروں، کھڑکیوں اور دروازوں پر کہنگی کے آثار ہیں، ہر پختہ اور کچی اینٹ پر امتدادِ زمانہ کے نقوش ثبت ہیں، اسی مکان کی نچلی منزل میں باورچی خانہ ہے، باورچی خانہ کی چھت برسوں کے دھوئیں سے سیاہ ہو چکی ہے جیسے اس پر سیاہ روغن کیا گیا ہے اور اپنے مکان کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے ابھر رہی تھی، اور اس گھر کے مکیں ۔ میرے شفیق ماں باپ، میرے عزیز چچا، چاچیاں، میرے پیارے بھائی بہن، چھوٹے چھوٹے بچے، اور ـــــ

"پتہ نہیں بانہال کا کیا حال ہوگا؟" تیجے کی سیٹوں پر نوجوانوں کی پارٹی بحث کر رہی تھی۔

"برف ضرور گری ہوگی ــــ"

"وہاں برف تو گرتی ہی رہتی ہے، فکر کاہے کی ــــ"

"برف بھی ہو تو کیا غم! ہم برف سے کیوں ڈریں گے!" ایک نوجوان جوش میں آکر بولا۔

"ہم پیدل چلیں گے ـــــ" دوسرا بھی جوش میں آیا۔

"میں پہلے بھی ایک بار بانہال کو پار کر چکا ہوں ـــــ" لمبا تڑنگا لڑکا بولا، وہی لڑکا جو کئیوں سے جھگڑ رہا تھا۔

"اس وقت پیدل جانا موت کے منہ میں جانے کے برابر ہے۔"

"مجھ میں نہیں آتا یہ کیا بکواس ہے ـــــ" خواجہ صاحب تنگ آکر

بولے، لڑکوں کی اس چک چک سے وہ تنگ آ گئے تھے، باقی سب خاموش تھے، صرف بیچ بیچ میں نوجوان سرزار قلمی گیت گنگناتا، اور جب وہ چپ ہو جاتا، تو گنڈا کر کے گانے کی کرخت آواز رہ رہ کر میرے کانوں تک آ جاتی، بس کے متواتر جھٹکوں اور انجن کے شور کے باوجود میں شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا، اور مجھے کیٹس کی نظم "ODE TO A NIGHTINGALE" کے شعر یاد آ رہے تھے:

باہر کی دنیا میں اب خوابوں کا فسوں پھیل چکا تھا، یہ خوابوں کی دنیا ہی تو تھی، ہم پریوں کی طلسمی دنیا سے گذر رہے تھے، ایک عجیب وغریب دنیا، جہاں آدم زاد کا نام و نشان تک نہیں، کسی اور مخلوق کا گذر بھی نہیں، جہاں بھیانک کالے وحشی پہاڑ صف بہ صف کھڑے ہیں، دیوزاد دیوپیکر، دیو قامت، ——— ان کے منہ کھلے ہوئے ہیں، ان کی سانسیں چلتی ہیں، تیز تیز، ان سانسوں کی بھاپ گہری دھند بن جاتی ہے، دھند پھیلتی ہے، سکڑتی ہے، گہری ہوتی ہے، اس دھند کے پیچھے پراسرار گھاٹیاں ہیں، جو پاتال کی نہ جانے کن گہرائیوں تک پھیلتی چلی گئی ہیں۔ ان گہرائیوں میں کتنے راز روپوش ہیں، مخفی اور ناہموار ڈھلوانوں پر جنگلی درخت دیوزادوں کی طرح پہرہ دے رہے ہیں، ہر طرف خاموشی ہے ——— راستے خاموش، چٹانیں خاموش، دیودار، چیل اور صنوبر کے درخت خاموش، کتنی گہری خاموشی ہے! جیسے ابھی ابھی جنازے اس دلیس سے گذرے ہیں کوئی نوشہ لب جلوہ گر ہو گی، حسین و جمیل شہزادی دیوؤں کی شاہزادی، لباس فاخرہ میں

ہیں ملبوس، اس کی لمبی لمبی مخروطی انگلیوں سے حنا کی خوشبو پھوٹتی ہے۔
اس کے عارض میں گلاب کھلتے ہیں، اور خم دار لبوں میں کنواری کلیاں مسکراتی
ہیں ـــــ وہ آرہی ہے بصد شان و ناز، اور پہاڑوں کی طلسمی آغوش میں
ایک مسند زرکار پر تشریف رکھتی ہے،

کیا خوابوں کے شہزادے کو اس کی نوش لب ملے گی؟ نوش لب
رشی ـــــ میرے خوابوں کی شہزادی ـــــ

اس کے ہلالی ابروؤں میں ہلکی سی جنبش ہوتی ہے، ساز بیدار ہوتے
ہیں، نغمے انگڑائیاں لیتے ہیں، دور دور تک جادو کے چراغ جل اٹھتے ہیں
پہاڑی راستوں پر پھول کھل اٹھتے ہیں، آسمان سے رنگ و نور کی بارش
ہوتی ہے ـــــ ہم جو اس طلسمی دنیا میں آئے ہیں، ہم انسان،
مہمان ہیں ان دیو پیکر پہاڑوں کے، ہم مہمانوں کے چتر کار شامیانے
میں بیٹھے ہیں ـــــ!

یہ جشنِ موسیقی ہمارے لئے ہے!
یہ جشنِ مسرت ہمارے لئے ہے!

ہم عجب ملک کے لئے نوش لب کو حاصل کرنے جا رہے ہیں ـــ!
عجب ملک ـــــ میں ـــ خوابوں کا شہزادہ، اور ـــ

"لیجیے بارش رک گئی ـــ" پنڈت جی نے مجھے حقیقی دنیا میں پہنچا دیا،
نوش لب اور عجب ملک دونوں دھند میں تحلیل ہو گئے۔

"واہگورو کی کرپا ـــ" سردار جی نے اطمینان کی سانس لی۔

پیچھے نوجوان ٹریننگ یافتہ ملازم باتیں کر رہے تھے، لیکن شملہ سے آئے ہوئے شخص کی گود میں پڑے ہوئے بچے کی ٹیں ٹیں سے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

جب ہم نندنی ٹاپ کی سرنگ کو پار کر چکے تو دن کافی چڑھ آیا تھا، اور پہاڑوں کے ایک اونچے سلسلے کے اوپر سے سورج نکل آیا تھا۔ بادلوں کا مہین نقاب اوڑھے ہوئے۔ گیلے پہاڑوں سے دھواں سا اٹھ رہا تھا، سورج کی نازک سی، پتلی سی، بے جان روشنی بس کے شیشوں سے چھن کر اندر آ رہی تھی، میں نے شیشہ اوپر اٹھا دیا۔ تازہ اور ٹھنڈی ہوا کا ایک نشہ آور جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا، میری روح میں تازگی کی ایک لہر دوڑ گئی، ہوا بہت ٹھنڈی تھی، لیکن بس کی گھٹی ہوئی فضا میں مجھے یہ خوشگوار معلوم ہوئی، حالانکہ میرے بغل میں بیٹھے ہوئے پنڈت جی نے اپنا منہ روئی سے ڈھانپ لیا۔

میں نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا۔

سب مسافروں کے چہرے پر خوشی کی چمک آ گئی تھی، نوجوان، جو بھیڑ کی سیاہ کھال کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا، آنکھیں بند کیے سو رہا تھا۔ کچھ اور مسافر بھی سو رہے تھے، ان کے سروں کو بس کی رفتار کی تیزی سے جھٹکے لگ رہے تھے، وہ جھٹکے کھا رہے تھے، لیکن ان کے پپوٹے بند تھے، کچھ لوگ غنودگی کے عالم میں دیکھ رہے تھے، بے معنی اور خالی خالی نگاہوں سے، سامنے کی سیٹ پر ایک نوعمر عورت تھی، چیک کا اوورکوٹ

پہنے ہوئے، سر پر اونی شال اوڑھے ہوئے، وہ باہر دیکھ رہی تھی، اس کے جوان اور تمتمائے رخساروں پر اس کی لانبی گھنی پلکوں کے سائے رقص کر رہے تھے، اس کی ناک ذرا لمبی تھی، جو اس کے نتھنوں پر زیادہ نمایاں دکھائی دے رہی تھی، لیکن اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں پر گھنی پلکوں کے دراز سائے بہت خوبصورت لگ رہے تھے انھیں دیکھ کر اس کی ناک کی لمبائی کے بھدے پن کا احساس فوراً مٹ جاتا!

اس کے پتلے ہونٹ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے!

میں نے اسے بس پر سوار ہوتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اس نے میری طرف نظر نہ اٹھائی، وہ کسی اور کی طرف بھی آنکھ اٹھانے کی روادار نہیں معلوم ہوتی تھی، جھکی جھکی پلکوں کے ساتھ وہ آفس کی کرسی پر بیٹھی تھی، اکیلی اور خاموش ـــــ اور میں کچھ دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا، ایک جوان عورت اپنے اداس حسن کی جادو وفا بینیوں کے ساتھ ہمارے ساتھ سفر کر رہی تھی، اور اس وقت مجھے پہاڑی راستوں کے تھکا دینے والے دن بھر کے سفر میں ایک انجانی راحت کا احساس ہوا ـــــ نہ جانے کیوں؟

اس عورت کے ساتھ ہی پتلی آواز والا ڈرائی کلینر بیٹھا تھا اس کا سر آگے کو جھکا ہوا تھا، نہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ میں نے سامنے کی کھڑکی سے باہر دور تک نظر دوڑائی دور کافی

فاصلے پر کھڑی ہو گئی تھیں، اور ان بسوں کی سواریاں وہاں ایک ہجوم کی صورت میں کھڑی تھیں۔

"بادشاہو، دیکھ لینا کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے" سردار جی سے رہا نہ گیا۔

ایک بار پھر ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا۔ اس نے گاڑی سٹارٹ کرنے کی کوشش کی، اور لوگ ہاتھ لگائے بس کے گرد سمٹ کر آئے، شروع کرو، شروع کرو، سب لوگ ایک ساتھ دھکا دو، ایک ساتھ زور سے کنڈکٹر نے نعرہ مارا، اور "یا علی" "یا علی مدد" ہے بھگوان، گورو جی کی جے کے نعرے لگاتے ہوئے۔ زور زور سے دھکا دینے لگے، بہت سے لوگ دھکا دے رہے تھے، بچی نالی میں پھنسی ہوئی اس بس کے مسافر بھی، اور دوسری بسوں کے جوشیلے اور مضبوط انسان بھی چونکہ وہاں سڑک آگے نیچے کو جاتی تھی، اور ساری سڑک بارش سے گیلی ہو چکی تھی، راستہ تنگ تھا۔ دائیں جانب نیچے تک ڈھلوان تھی، اور بائیں جانب پہاڑ کے ایج کے ساتھ مٹی کی نالی سی بنی تھی، جس سے تیز بارش میں پانی بہتا ہے، اسی نالی میں ایک میل بس پھنس گئی تھی، اور بس کے ایک طرف کے دونوں پہیئے گیلی مٹی میں دھنس گئے تھے اور بس پہاڑ کی طرف جھک گئی تھی، لوگ شکر ادا کر رہے تھے کہ بس دائیں جانب کو پھسل نہیں گئی، اگر خدا نخواستہ ایسا ہوتا۔ تو وہ لڑھکتے ہوئے

چٹانوں اور پتھروں سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نہ جانے موت کے کن تاریک غاروں میں گم ہو چکی ہوتی! ڈرائیور کی مشاقی اور خدا کی مہربانی نے انہیں بچا یا تھا۔ بس ایک زبردست جھٹکے سے نالی میں اتر گئی تھی، دو آدمیوں کو کچھ سی چوٹیں بھی آئی تھیں "اخبار منزل" کے اڈیٹر پرویز نے مجھے یہ ساری تفصیل سنائی، وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا، اس نے بند گلے کا گرم کوٹ پہن رکھا تھا، اور سر پر سیاہ رنگ کی جیڑ کی کھال کی بنی ٹوپی پہنے تھا، آدمی جوان تھا، ایف، ایس، سی کئی برسوں تک پاس کرنے کی کوشش کرتا رہا کئی بار امتحان میں شامل ہوا، لیکن بے سود، فیل ہونے پر ہر بار یار دوستوں سے کہتا رہا کہ اس کی طبیعت شعر و ادب کی طرف مائل ہے۔ سائنسی مضامین کا مطالعہ صرف مغز ماری ہے اور بس۔ آخر اس نے امتحان سے تنگ آکر تعلیم ہی کو خیرباد کہا، دو تین سال ادھر ادھر پھرتا رہا۔ دفتروں کے چکر کاٹتا رہا۔ اور آخر اخبار منزل کا اڈیٹر بن گیا، اس دن وہ اچانک مسجد سے ملا، امپیریل ہوٹل میں ایک فائیل بیگ ہاتھ میں لے کر اور اسی دن چائے کا ایک کپ پیتے ہوئے مجھے پتہ چلا کہ اس نے "منزل" جاری کیا ہے، میں خوش ہوا، حالانکہ میں جانتا تھا کہ میری خوشی عارضی ہے، مجھے اسی وقت خیال آیا تھا کہ منزل کے خواب دیکھنے والا یہ جوشیلا نوجوان نہ جانے کن اجنبی راستوں پر بھٹک جائے گا، چند اشاعتوں کے بعد ہی پرچے کا جو حشر ہونا تھا، وہ میں "منزل" کے ساتھ

بھی ہوتے ہوئے دیکھ چ... ...ب نے اُس کا دل رکھنے کے لیے اس کے اس اقدام کی تعریف ... اور اپنے قلمی تعاون کا وعدہ بھی کیا تھا، اور آج ایک سال کے بعد پرویز میرے سامنے تھا، ہماری بس بھی رک گئی تھی، میں بس سے نیچے اتر کر نالی میں پھنسی ہوئی بس کی طرف دیکھ رہا تھا، سب لوگ وہیں جا رہے تھے، اب تک چار بسوں کے لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے، جیسے وہاں میلہ لگ گیا تھا، میں نے آگے کی طرف نظر اٹھائی، وہاں چند آدمیوں کا گروہ تھا، ارے، ان میں شاید وہ ایڈیٹر کا بچہ بھی ہے. میں سوچنے لگا، آگے بڑھا، اور واقعی میرے سامنے پرویز تھا، نیلی نیلی آنکھوں والا سرخ و سپید رنگت والا خوش شکل پرویز، ہم نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

"میں لکھنؤ سے آ رہا ہوں ———" میں نے پرویز کے پہلے سوال کا جواب دیا۔

"لکھنؤ ——— کب گئے تھے؟ کیوں گئے تھے؟ کب تک رہے وہاں؟" اس نے سوالوں کی بوچھاڑ شروع کی، میں ... سب جوابات دے اور پھر پرویز نے کہا کہ وہ ایک سال تک دہلی میں رہا، ایک ہفت روزہ میں کام کرتا رہا، لیکن ایک ماہ پہلے لوٹ آیا، اور اب "منزل" کے لئے دوبارہ ڈیکلریشن حاصل کرنے کے لئے اسے بڑی کاوش سے کام لینا پڑا، چنانچہ اب وہ سرینگر پہونچتے ہی تازہ شمارہ اہتمام کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔

پرویز کی آپ بیتی سننے کے ساتھ ساتھ میری توجہ بس کی طرف بھی لگی ہوئی تھی، بس، اب بھی اس دلدل سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی، اور دل ہی دل میں مجھے تشویش ہو رہی تھی، جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے کچھ گز کے فاصلے پر دو عمر رسیدہ پنڈتانیاں بیٹھی تھیں، رفل کے لمبے لمبے، ڈھیلے ڈھالے، لمبی لمبی آستینوں والے فرن پہنے ہوئے، اور ان کے ساتھ ہی ایک سات آٹھ سالہ بچی کھڑی تھی، شرمیلی سی، چنچل سی، حیران سی پیاری بچی، جس کے ننھے ہاتھوں میں چھوٹی سی کانگڑی تھی، پنڈتانیوں کے پاس ہی ایک آدمی کھڑا تھا، لوئی کا بنا ہوا کوٹ اور پاجامہ پہنے ہوئے، گول گول چہرہ، سر پر کشتی نما ٹوپی، آنکھوں میں معمولی سے فریم کی بنی ہوئی عینک لگائے وہ زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا، شاید بھگوان کو یاد کر رہا تھا، کچھ اور فاصلے پر ایک اور پنڈت جی کھڑے تھے، چہرے پر مایوسی اور بے بسی لئے ہوئے، وہ کسی سوچ میں گم تھے اور بار بار پلکیں جھپکا رہے تھے، "خدا کرے بس اس بار نکل آئے، وہ دیکھئے، وہ دیکھئے، وہ۔"
پرویز زور سے بول اٹھا:

پنڈت عورتیں غیر اختیاری طور پر کھڑی ہو گئیں، چھوٹی بچی تالی بجانے لگی۔ اُس نے کانگڑی بوڑھی پنڈتانی کو دے دی تھی۔

اور بس کے گرد لوگوں کے ہجوم کا شور بڑھ گیا۔

لوگ اپنی پوری طاقت سے بس کو آگے دھکیل رہے تھے، "یا علی مدد"، "بڑشاہ بادشاہ" کے نعرے لگ رہے تھے،

"وہ دیکھیے، وہ نکل گئی، لیکن ــــــــ" پرویز کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

بس کا اگلا پہیہ تو نکل آیا تھا، لیکن پچھلا ایک پہیہ ابھی تک گیلی مٹی کے دلدل میں پھنسا ہوا تھا، ہماری بس کا جوشیلا نوجوان سب سے آگے آگے تھا اور اب وہ کچھ اور لوگوں کو بڑے بڑے پتھر لانے کو کہہ رہا تھا۔ یہ پتھر گیلی مٹی پر گرائے جا رہے تھے، سردار جی لوئی ایک طرف رکھ کر زور سے دھکا دے رہے تھے، ہماری بس کی وہ تنہا تنہا عورت راستے کے ڈھلوان کی طرف ریت اور پتھر کی چھوٹی سی دیوار کے ساتھ کھڑی تھی، اس کے بائیں ہاتھ میں چھوٹا سا ہینڈ بیگ تھا۔ اور وہ سڑک کی طرف پیٹھ کر کے، آگے پہاڑوں کی کھلی، وسیع، دھندلائی ہوئی آغوش کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سورج پھر بادلوں کے دبیز پردوں میں چھپ گیا تھا، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بدن کے اندر گھس رہے تھے، خواجہ صاحب شالے سے اپنے فربہ جسم کو چھپائے ہوئے، دور کھڑے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے، ان کے چہرے پر غصہ اور حقارت کی لکیریں ابھر آئی تھیں، شاید وہ دل ہی دل میں دوسری بسوں کے ڈرائیوروں اور مسافروں کو گالیاں دے رہے تھے۔

"ایک ہی بس تو پھنس گئی ہے، سب دیکھ رہے ہیں لیکن دوسری بسوں کو کیا ہوا؟ کیا ایک آدمی کے لئے سو آدمی مر جائیں؟ یہ کہاں کی دانائی ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا۔" ان ڈرائیوروں کو بھی شام تک یہیں مرنا ہے، اس خوفناک پہاڑ پر ——— سمجھ میں نہیں آتا ———"

——— جب پرویز اور میں ان کے قریب سے گذرے، تو وہ ہم سے مخاطب ہوئے، جیسے اپنے آپ سے کہہ رہے ہوں، اُن کے چہرے پر تاریکی سی چھائی ہوئی تھی۔

اچانک مجھے اُن تین حسین عورتوں کا خیال آیا۔ جو بس اڈے پر نظر آئی تھیں، کسی اور بس سے سفر کر رہی ہوں گی وہ، لیکن نہیں، اس بس میں انور صاحب بھی تھے، شاید اور ——— اور وہ رہے انور صاحب، جو لوگوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ سمجھا رہے تھے، لیکن وہ عورتیں ———؟

ہم رک گئے۔

بس کے پچھلے پہیئے کے ساتھ بڑے بڑے پتھر رکھے گئے تھے، اور ڈرائیور پھر بس سٹارٹ کرنے لگا تھا۔

اچانک پیچھے سے مترنم نسوانی قہقہوں کی آواز آئی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ سڑک سے دور، وہ پارٹی آرہی تھی سوئٹر اور چست پینٹ میں ملبوس لڑکی کے ہاتھ میں کیمرہ جھول رہا تھا۔ دوسری اکہرے بدن کی لڑکی ہنسی سے دوہری ہو رہی تھی۔ اس کے سفید دانتوں کے موتی چمک رہے تھے، اور تیسری لڑکی، آوارہ بالوں

کی پھیلی ہوئی گھٹاؤں میں پوڈر سے دمکتے ہوئے چاند جیسے چہرے کے ساتھ، وارفتہ نگاہوں سے پہاڑوں کی غیر مانوس اور اجنبی فضاؤں کو دیکھ رہی تھی، اور بھرپور جسم کا بوجھ سنبھالے ہوئے ادائے ناز سے تول تول کر قدم اٹھا رہی تھی، اس کے بائیں ہاتھ کو ڈارک بلیو سوٹ کے ساتھ برف جیسی سفید قمیض میں ملبوس کارٹون نما ایک مرد تھامے ہوئے تھا۔ وہ مرد کالی عینک بھی پہنے ہوئے تھا، کالے رنگ کا دوسرا خوش پوش مرد ماتھے پر جھکی ہوئی فلٹ لئے، ایک ہاتھ میں کیمرہ اٹھائے بغل میں دوربین سنبھالے، سامنے لوگوں کے ہجوم کو دیکھ رہا تھا، اچانک پہلی لڑکی جو چند لمحات کے لئے سنجیدہ ہو گئی تھی، ایک دم دفور مسرت سے اچھل پڑی۔

"LOOK HOW FINE" اس نے مسرور لہجے میں لوگوں کے ہجوم اور دلدل میں الجھی ہوئی بس کی طرف اشارہ کیا۔

"Excellent" دونوں لڑکیوں کے منہ سے بے اختیار نکلا، اور پہلی لڑکی نے فوراً کیمرہ ٹھیک کر لیا، جسم کو بل دے کر ماتھے پر جھولتی ہوئی زلف پریشان کو پیچھے جھٹک دیا، اور بدن کو جھکا کر اور سمٹا کر کیمرہ کو دائیں آنکھ کے سامنے لگا دیا۔ ایک لمحہ میں اس نے بٹن دبا کر اس منظر کو کیمرے میں قید کر لیا۔ جو اس وقت سیوں کے لئے مرکز توجہ تھا،

اچانک بس کا پچھلا پہیہ نکل گیا۔ مسرت کا شور بلند ہوا، دھکا

دینے والے لوگ فخر سے پھول گئے۔ اور مایوس نظروں سے دیکھنے والے
مسافروں کے چہرے مسرت سے جگمگا گئے؛
"واہگورو کی کرپا ہے" سردار جی نے لوئی پھر اوڑھ لی، اور
جلدی سے بس کی طرف دوڑے۔
"مدراس سے آئے ہیں یہ لوگ" پرویز مجھے کہہ رہا تھا "تینوں
ایکٹریس ہیں اور وہ لوگ، وہ جو سردسا تھ ہیں ان کے معمولی سے ایکٹر
دکھتے ہیں، شوٹنگ کرنے کشمیر جارہے ہیں، وہ بڑی سی لڑکی ہے نا؟
خوب گاتی ہے راستے بھر گیت سناتی رہی، سالی کی آواز ہیں جیسے جادو
ہے، بھئی ان لوگوں کے ساتھ مزے سے سفر کٹ رہا ہے"
"چلو ـــــ چلو جی جلدی .... کنڈکٹر کی گرجدار آواز آئی۔
"آیئے جناب، اب بیٹھتے ہیں بس ہیں" پنڈت جی میرے قریب سے
سرگوشی کرتے ہوئے گذرے۔
سب لوگ جلدی جلدی اپنی بسوں میں گھستے جارہے
تھے، میں نے پرویز سے ہاتھ ملایا۔ اسے الوداع کہی۔
"ہیلو مسٹر!" پہلی لڑکی نے پرویز کو پکارا۔
میں آگے جانے لگا، اور وہ لڑکی پرویز سے ملائم اور
مترنم لہجہ میں پوچھ رہی تھی۔
"SNOW ہی کب نظر آئے گی؟"

بس کُدسب سٹیشن سے آگے نکل چکی تھی، اور میں اب بھی اُدھم پور کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُدھم پور، جموں سے بیالیس میل دور، بانہال کارٹ روڈ پر ایک پھلتا پھولتا قصبہ ہے۔ اس کے مشرق و مغرب میں فلک بوس پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ قصبہ سطح سمندر سے ۲۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اُدھم پور خوبصورت مندروں قلعہ رام نگر اور تاریخی مقامات کے لئے مشہور ہے۔

اس کے تھوڑے ہی فاصلے پر کدسب سٹیشن ہے۔ چھوٹی سی پہاڑی جگہ۔ جو تاریخی اہمیت کے جیل خانے کے لئے مشہور ہے۔ جہاں سالہا سال تک آزادی، خودمختاری اور دوستی کے خواب دیکھنے والوں کو آہنی سلاخوں کے پیچھے نظر بند کیا جاتا رہا ہے۔ وہاں خاص سڑک پر چند معمولی سی دکانیں ہیں اور بس، ہم کدسب سٹیشن پر نہیں رکے۔ جب وہاں سے ہم آگے نکل آئے تو پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیوں پر برف کی سفید تہیں نظر آنے لگیں، یہ وہ چوٹیاں ہیں جن پر آج صدیوں سے برف جمی ہوئی ہے ریت اور پتھر کے بنے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیوں پر نئی چوٹیاں بن چکی ہیں

ایسی اجلی یخ بستہ برف کی چوٹیاں، یہ چوٹیاں، زمین کی پستیوں سے دور، آسمان کی بلندیوں کی طرف پرواز کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ چوٹیاں احساس غرور لئے، آسمان کی بے پایاں وسعتوں میں جگمگاتی ہیں۔ ان کو آج تک کوئی چھو بھی نہیں گیا ہے۔ انسان کے قدم ان عظیم بلندیوں تک نہیں پہونچ سکے ہیں ——— یہ صاف وشفاف، تابندہ، کنواری چوٹیاں ان کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں ——— کوئی دھبہ نہیں!!

لمبی راستے کے ہر موڑ اور ہر خم کے ساتھ جھٹکے کھا رہی تھی ان متواتر جھٹکوں سے میری طبیعت مکدر سی ہونے لگی تھی، ابھی ابھی شملہ سے آئے ہوئے شخص کی بیوی کو قے آئی تھی، میرا جی بھی متلا رہا تھا۔ سر بھاری سا ہونے لگا تھا، ادھر ہر نئے موڑ پر بس کے متواتر ہچکولے اور جھٹکے میرے سارے جسم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے تھے ———

کتنے موڑ ہیں ان راستوں میں، کتنے پیچ وخم، اور ان پرپیچ راستوں پر گذرتے ہوئے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ انسان کا جسم تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ ہر بند دکھنے لگتا ہے۔ خیالوں کی دنیا میں یخ بستہ دھند پھیل جاتی ہے، انسان کی روح بغاوت پر آمادہ ہوتی ہے۔

لیکن ——— لیکن ———؟

لیکن کبھی کبھی ان راستوں سے گذرنا ناگزیر بھی بن جاتا ہے راستوں کے یہ دشوار گذار مرحلے ہی منزل کا پتہ دیتے ہیں، زندگی کے ان ہی دشوار راستوں پر چل کر انسان زندگی کا سراغ پا لیتا ہے!

"سردی بہت ہے اس طرف ——" پنڈت جی بولے، نرم اور پرسکون لہجے میں، وہ جب بھی بولتے ہیں مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے پاس ہی کہیں نرم آہٹ جاگ رہی ہے۔

"جی ہاں ——" میرے آوارہ خیالوں کا ہجوم بکھر گیا۔

سرد و برفانی ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے!

ڈرائیور بڑی ہوشیاری، توجہ اور چابکدستی سے راستے کے ہر موڑ سے بس کو ڈرائیو کر رہا تھا —— اس خطرناک راستے پر چپے چپے پر موت کے پہرے ہیں۔ اور ڈرائیور کی معمولی سی غلطی یا غفلت ساری ہم سب کو موت کے تاریک غاروں میں دھکیل سکتی ہے ایک آدمی کے رحم و کرم پر کتنے لوگوں کی زندگی ہوتی ہے۔ میں جب بھی کسی بس پر سفر کرتا ہوں تو سب سے پہلے بس کا ڈرائیور میری توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ اور جب میں ڈرائیور کے چہرے پر ایک بھرپور نظر نہ ڈالوں، مجھے اطمینان نصیب نہ ہوتا، میں ڈرائیور کے چہرے پر غیر معمولی اطمینان اور سکون کی تلاش کرتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ وہ چڑچڑی یا غصیلی طبیعت کا نہ ہو، اس کے چہرے پر فکر و تردد کی لکیریں نہ ہوں، اس کی آنکھوں میں وحشت سی نہ ہو، وہ اداس نہ ہو، تخیل پرست نہ ہو، لباس اور ظاہری ہیئت سے قلاش نہ دکھائی دیتا ہو —— اور جب میں دیکھتا ہوں کہ یہ سب چیزیں

اس میں دکھائی نہیں دیتیں تو مجھے قدرے اطمینان نصیب ہوتا ہے
میں اللہ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ آدمی نارمل ہے، لیکن اگر ان چیزوں
میں کسی چیز کی موجودگی کا مجھے اس میں احساس ہوا، تو پورے سفر
میں، میں اپنی جان ہتھیلی پر لئے رہتا ہوں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے
کہ ان میں بیک وقت کئی چیزیں مجھے ڈرائیور میں نظر آتی ہیں، اس
لئے پریشانی لاحق رہتی ہے۔

"اس پتنی ٹاپ سے مجھے ڈر لگتا ہے ــــ" سردار جی مجھ سے
مخاطب ہوئے۔

واقعی ہم اس وقت بہت ہی بلند و بالا پہاڑ سے گذر
رہے تھے، اور دائیں بائیں، نیچے، بہت نیچے پیچ در پیچ ڈھلوانیں تھیں،
گہرائیاں تھیں، کھڈ تھے، غار تھے، ان مہیب اور سیاہ گہرائیوں
میں موت کے سائے منڈلا رہے ہیں، ان کو دیکھ کر ڈر اور دہشت
سے انسان کا دل ڈوبنے لگتا ہے۔

"آج سے دس سال پہلے کی بات ہے بادشاہو ــــ" سردار جی
نے لوئی کو شانوں پر اچھی طرح سے لپیٹ کر کہا، پنڈت جی متوجہ
ہوئے، میں بھی سردار جی کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں جموں جا رہا تھا، یہ اس وقت کی بات ہے، جب آبادی
نہیں آئی تھی، اس راستے کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا، آج تو جگہ جگہ کام
لگا ہوا ہے، جو کہیں سڑک خراب ہوئی تو درجنوں قلی کام پر لگ جاتے

ہیں، ان دنوں کی بات اور تھی ـــــــ"

"اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

"بادشاہو، اسی تینی ٹاپ پر ہماری بس پھنس گئی ـــــ"

"کیا ہوا بس کو؟" پنڈت جی نے فوراً استفسار کیا۔

"ہونا کیا تھا برف آٹھ نو فٹ گری ـــــ"

"آٹھ نو فٹ ـــــ؟"

"وہ تو کم ہے، تھوڑی سی گری، یہاں اتنی برف گرتی ہے بادشاہو، کہ توبہ کرو، اور جب کہرا لگ جاتا ہے، تو برف کے پہاڑ بن جاتے ہیں ـــــ"

"اچھا تو پھر کیا ہوا؟ ـــــ" پیچھے سے نسوانی آواز والے ڈرائی کلینر نے اشتیاق سے پوچھا میں نے دیکھا، دوسرے لوگ بھی متوجہ تھے۔

"ہونا کیا تھا، راستہ بند تھا، ہماری بس برف میں پھنس گئی رات ہم نے بس ہی میں بیٹھے بیٹھے گذاری، برف رکنے کا نام نہ لیتی تھی، اور پھر ـــــ"

"پھر کیا ہوا؟" ڈرائی کلینر نے جلدی سے پوچھا،

"ہونا کیا تھا، بس ہفتوں تک وہیں پھنسی رہی ـــــ"

"اور آپ؟"

"ہم لوگ کدھ تک پیدل چلے آئے ـــــ"

"اتنی برف میں پیدل آئے؟" خواجہ صاحب نے قدرے حقارت سے پوچھا۔

"اور کیا کرتے کھواجہ صاحب؟"

"عقل کے خلاف کیا ہے، شکر کرو بچ گئے، پہاڑی راستے پر اور اتنی برف میں اتنی دور پیدل چلنا تو موت کو دعوت دینا ہے" وہ وضاحت کر رہے تھے، میں نے دیکھا، بات کرتے کرتے ان کے بھرے بھرے گندمی رنگ کے چہرے پر گھنی گھنی مونچھیں پھڑک رہی تھیں۔

"لیکن کھاجہ صاحب یہاں ٹھہر کر بھی کو نسا زندہ بچنا تھا" سردار جی نے چڑ کر کہا اور خاموش ہو گئے۔

سب خاموش ہو گئے!

— خاموشی کا ایک طویل اور تھکا دینے والا وقفہ!!

میرا ذہن خالی تھا۔ اور میرا جسم تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ میری بوجھل پلکیں جھکنے لگیں، نیندوں کی دیوی مجھے پہاڑوں کے اس پار کہ پوش وادیوں میں بلا رہی تھی، میں اب بھی تکٹکی لگا ہوں سے حد نظر تک پھیلی ہوئی کھائیوں اور گھاٹیوں سے دور، پہاڑوں کی کھلی آغوش میں صدیوں کی جمی ہوئی سیمیں برف دیکھ رہا تھا، یہ بہ فیلے پہاڑ کتنے بڑے ہیں، کتنے وسیع۔ کتنے مضبوط ____ اور انسان ان کے مقابلے میں کونسی حیثیت رکھتا ہے؟ کچھ نہیں،

کچھ بھی نہیں، یہ حقیر اور کمزور انسان، فانی اور ناپائیدار، لیکن یہ لازوال پہاڑ ــــــ یہ ازلی اور ابدی قوت کے مظہر!

میری آنکھ لگ چکی تھی!

اور جب میری نیند ٹوٹی، تو بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی تھی۔

"جلدی سے کھانا وانا کھائیے، جلدی کیجیے، جلدی ــــــ" ڈرائیور کہہ رہا تھا، وہ کھڑکی کھول کر بس سے اترا۔ لوگ جلدی جلدی بس سے نیچے اتر رہے تھے، پنڈت جی بھی چپکے سے اترے۔

"کونسی جگہ ہے؟" ڈرائی کلینر نے پوچھا۔

"بٹوت ہے جی بٹوت" کنڈکٹر نے گرجدار آواز میں کہا۔

"چلیے، گرم گرم پوریاں کھالیں گے۔" سردار جی مجھ سے بولے

"میں کچھ نہیں کھانا چاہتا سردار جی ــــــ" میں نے کہا "میری طبیعت ٹھیک نہیں"

کچی نیند کے خمار سے میری آواز بوجھل تھی۔

"یہ سفر ہی ایسا ہے بادشاہو۔ خوامخواہ طبیعت خراب ہو جاتی ہے" یہ کہہ کر وہ اترے اور آگے سڑک پر ہو لیے۔

سب لوگ دیکھتے ہی دیکھتے بس سے اترے

لیکن وہ عورت ــــــ؟

وہ اطمینان سے بیٹھی تھی، اور سڑک کے دائیں طرف دو تین

چھوٹی سی دکانوں کی طرف دیکھ رہی تھی، جن میں لوگ گھس رہے تھے۔

میں نے انگڑائی لی، کیوں نہ ٹہل کر آجاؤں، طبیعت کھل اٹھے گی، یہ سوچکر میں بس سے اترا، لیکن دو قدم ہی چلا تھا کہ بوندا باندی شروع ہوئی، سب لوگ ڈرنے لگے، اور دکانوں کے چھجوں کے نیچے پناہ لینے لگے، میں جلدی سے واپس بس کی طرف آیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھا، وہ عورت وہیں بیٹھی تھی، لیکن مجھے واپس آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے مجھ سے نظریں ملائیں بغیر کسی جھجک کے۔ اور بس سے نیچے اتری۔

آیئے، ہم بھی کچھ کھا پی لیں، شاید اس کی آنکھیں کہہ اٹھیں لیکن اس کے ہونٹ خاموش تھے۔

میں سیٹ پر ہی بیٹھا رہا، اور تھوڑی دیر میں میری آنکھ لگ گئی بیس پچیس منٹ گزر گئے۔

"اتار دو بستر جلدی ہے، جلدی کرو ——" لمبا نظر لگتا لڑکا زور سے بولا۔ وہ بس سے باہر اوپر چھت کی طرف دیکھ رہا تھا میں ہڑبڑا کر چونک اٹھا، بس میں ابھی کوئی اور نہ چڑھا تھا، یہ لوگ کہاں مر گئے، ڈرائیور کیوں آتا نہیں، میں نے بے چینی میں گھڑی دیکھی، ایک بج رہا تھا، کھانا کھانے میں انہیں کتنی دیر لگ جائے گی۔؟

عجیب بات ہے۔!

"اس راستے کی ایسی تیسی، اسے آج ہی خراب ہونا تھا" وہ لڑکا بڑبڑا رہا تھا، میرا دماغ چکرا یا میں فوراً بس سے اترا!

"یہ لوگ چلتے کیوں نہیں ہیں؟" میں بوکھلا سا گیا تھا۔

"کہاں جائیں گے جناب؟" سامنے سے ڈرائیور آرہا تھا۔ اس کے چہرے کی جھرّیوں میں تناؤ آگیا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"ٹریفک انسپکٹر نے کہا، راستہ خراب ہے، کوئی بس نہیں جا سکتی ہے"

میں بے حس و حرکت کھڑا رہا، آگے میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا، اور ڈرائیور کہہ رہا تھا۔

"پتہ نہیں کتنے دن لگیں گے، ادھر سے موسم اچھا نہیں، بڑی مشکل ہے، مجھے آج سرینگر پہونچ جانا تھا ضرور، اور کل ہی جموں واپس لوٹنا تھا۔ گھر پر ابھی سب کام دھرا پڑا ہے۔ سب کاموں سے نبٹنا ہے ابھی، آپ ہی کہئے جناب کسی کے گھر بیٹے کی شادی ہو تو وہ کیسے گھر سے باہر رہ سکتا ہے۔ اور جبکہ شادی کو صرف پانچ دن رہ گئے ہوں، یہ نوکری بھی بڑی مصیبت ہے۔ آدمی اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا، غلامی ہے یہ نوکری بھی، مجھے تو ——"

"لیکن اب کیا کیا جائے؟" میں نے گھبراہٹ میں اس کی بات کاٹی۔

"کرنا کیا ہے، بس کوئی کمرہ دیکھ لیجئے کسی جگہ، اور مزے سے رہ جائیے ـــــ" یہ کہکر وہ آگے چلنے لگا، وہ آگے نکلا، بس کی چھت سے سارے بستر ے غائب ہو چکے تھے، صرف سوٹ کیس اور دوسرا سامان وہاں باقی رہ گیا تھا۔ ٹریننگ یافتہ لڑکے بھی اپنے بستر ے کندھوں پر لئے بھاگے جارہے تھے۔ کنڈکٹر چھت پر کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا،

چند لمحات تک میں کھڑا رہا، بے حس وحرکت، جیسے میں وہاں ایک مجسمے کی طرح نصب کیا گیا تھا۔ کچھ سوچ کر میں تیزی سے آگے چلنے لگا۔ میرے قدم سامنے دکانوں کی طرف اٹھ رہے تھے میں نے پیچھے مڑکر دیکھا، بسوں اور ٹرکوں کی ایک قطار کھڑی تھی اور سامنے، دور تک سڑک پر اور بسیں بھی تھیں، سب خالی تھیں، یہ سب لوگ کہاں گئے؟ کہاں چھپ گئے؟ کیا سب کے سب ہوا میں تحلیل ہو گئے؟

پنڈت جی اور سردار جی ـــــ؟

تیلی سی آواز والا ڈرائی کلینر ـــــ؟

اور دوسرے، یہ سب کہاں گئے ہیں؟

میں تیزی سے چلنے لگا، اور فوراً سڑک کی دائیں جانب ایک دوکان میں گھس گیا۔

دکان کیا تھی؟ ایک اصطبل نما کمرہ، دکان کے سامنے ایک

بوسیدہ چھجّے کے نیچے مٹی کا بنا ہوا ایک بڑا چولہا تھا، اور چولہے پر گرم گرم پوریاں پک رہی تھیں، دوکاندار گندے کپڑے پہنے، ہاتھوں پر میل کی ایک دبیز تہہ جمائے ہوئے آٹا گوندھنے میں مصروف تھا۔ چولہے کے سامنے دو تین آدمی کھڑے تھے اور دکان کے اندر، بوسیدہ اور گندی دیواروں کے ساتھ بیٹھے سے لوگ دبکے بیٹھے تھے، کمبلوں اور گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے۔ ساتھ والی دکان سے ریڈیو سیٹ سے لتا منگیشکر کا مسرور کن گیت ماحول کی اداسی، بے حسی اور بیچارگی پر طنز کر رہا تھا!

●

کچھ دیر دکان میں بیٹھ کر میں پھر اٹھ کھڑا ہوا، وہاں مجھے کوفت سی ہونے لگی، لوگ راستے کی اچانک خرابی پر اظہار خیال کر رہے تھے، کچھ لوگ کہہ رہے تھے، سڑک پر کام لگا ہوا ہے، دو تین گھنٹے کے اندر اندر راستہ ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ لوگ مایوسانہ لہجے میں کہہ رہے تھے کہ ایک دو دن تو ضرور لگیں گے، کوئی کہتا، حکومت بہت جلد جیرہنی سے انجنیروں کو بلا رہی ہے، پھر کبھی راستہ بند نہیں ہوگا۔ کوئی کہتا، کل تو ضرور کالو نائے لگ جائے گی، اس موسم میں راستہ کا ہے کو خراب ہوگا۔ اور کوئی مایوسی اور گھبراہٹ میں اس کی تردید کرتا، اور موسم کی خرابی پر تشویش کا اظہار کرتا۔

یہ سب بکواس ہے، کسی کو کچھ پتہ نہیں، میں جھنجھلا کر دوکان سے باہر نکل آیا، سردار جی سڑے سے ایک پست قد کے ٹھنگنے سے آدمی سے بات کر رہے تھے، وہ آدمی ایک نئے سلے ہوئے بلیو رنگ کے اوورکوٹ میں ملبوس تھا۔

" بادشاہو کل تک راستہ ٹھیک ہوگیا تو سمجھو گھنٹہ ستی ہے

ورنہ ـــــــ "ورنہ کیا ـــــــ؟" وہ آدمی پوچھ بیٹھا، بے چینی اس کے لہجے میں بھی تھی۔ اور اس کے چہرے پر بھی۔

"آیئے، آیئے جناب، کہاں ٹھہرے آپ؟" سردار جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"میں ـــــــ؟ ابھی، ابھی تو کوئی جگہ نہیں ملی" میں اپنی شرمندگی اور بے بسی چھپا نہ سکا۔

"گویا آپ بھی میرے ہی ساتھ ہیں ـــــــ ہاہاہا" وہ زور سے ہنس پڑے۔

ان کی یہ بے وقت کی ہنسی مجھے بہت بری معلوم ہوئی۔

"مصیبت یہ ہے صاحب" وہ آدمی کہنے لگا "یہاں کوئی ڈھنگ کی جگہ ہے نہیں، آدمی رات بسر کرے تو کہاں کرے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کسی مصیبت میں پھنس گئے، ہم لوگ ـــــــ"

"مصیبت ایسے ہی آتی ہے بادشاہو ـــــــ" سردار جی کہنے لگے، وہ باتیں کرتے رہے۔۔ میں مزید اُن سے کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا آیا۔

لوگوں نے رات کاٹنے کے لئے دکانوں کے تاریک حصے اور معمولی سے ہوٹلوں کے گندے کمرے کرائے پر لے رکھے اور وہاں چپ چاپ بیٹھے تھے، میں نے قریب قریب پانچ سات

ایسی دکانوں کو چھان مارا، لیکن ان میں رہنے کی مطلق گنجائش نہ تھی، ڈاک بنگلہ سے کچھ دور، معمولی سے ہوٹلوں کی نچلی منزلوں کے بند کمروں میں بھی لوگ براجمان تھے، تعجیل اور پریشانی میں جس آدمی کو جہاں سر چھپانے کی جگہ ملی تھی، وہ وہاں چپک گیا تھا۔

میں بڑی تیزی سے ڈاک بنگلے کی سمت چلنے لگا

سامنے سے پنڈت جی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

"بڑی مشکل میں پڑ گئے جناب ــــــ" وہ تشویشناک لہجے میں بولے۔

میں نے ان کی طرف دیکھا، کریدتی ہوئی نظروں سے۔

"میں ابھی ابھی پی، ڈبلیو، ڈی والوں سے ملا ــــ" وہ لمبی سانس لے کر بولے، آنکھیں باہر نکال کر ــــــ "سنا کہ راستہ بہت خراب ہوا ہے، آج رات کو ہی ایسی گڑبڑی ہے، بعض جگہوں پہاڑ بڑے پھسے ہیں، معمولی سی بارش ہوئی اور مٹی اور ریت کے انبار نیچے کھسک آتے ہیں۔ بنے بنائے راستے برباد ہو جاتے ہیں۔ ادھر سے آسمان پر بادل بھی ہیں، بھگوان کے ہاتھ میں ہے کہ ــــ"

"کل تک تو راستہ ٹھیک ہو گا ہی ــــــ"

"امید تو ہے۔ لیکن پی ڈبلیو ڈی والے کہہ رہے تھے راستہ کئی جگہوں پر خراب ہے ــ"

"کبھی جگہوں پر؟"

"ہاں اور کیا ——" پنڈت جی کی غلافی آنکھیں اور زیادہ باہر نکل آئیں۔

"یہی تو مشکل ہے، پہاڑی جگہ ہے یہاں، سر چھپانے کو جگہ نہیں، دکانیں معمولی سی ہیں، اور —— جیب میں پیسہ بھی کافی نہیں ——"

"گھبرائیے نہیں، کل تک راستہ ضرور ٹھیک ہوگا ——" میں نے اسے اطمینان دلانے کے لئے کہا۔ شاید میں اپنے آپ کو ہی اطمینان دلا رہا تھا۔ پنڈت جی آداب کہکر چلے گئے، اور اچانک میرا ہاتھ کوٹ کی اندر کی جیب کی طرف اٹھا، میں نے پرس کھولا —— سترہ روپے اور چند آنے!

میں نے اطمینان کی سانس لی۔

میں ڈاک بنگلے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا، تو ادھر سے پر ویز آ رہا تھا۔

"آپ بھی ٹھہرے ہیں ڈاک بنگلے میں؟" وہ پوچھ بیٹھا۔

"وہیں تو جا رہا ہوں ——" میں نے مبہم سا جواب دیا، "اور آپ ——؟"

"بھئی جگہ کے لئے بڑی پریشانی ہوئی —— ڈاک بنگلہ میں کوئی کونہ خالی نہیں، میں نے باتھ روم پر قبضہ کر لیا، مرتا کیا نہ کرتا،

یہ کہکر وہ چلا گیا، مجھے مایوسی ہوئی، لیکن میرے قدم آگے ہی آگے اٹھنے لگے، اور ڈاک بنگلہ خاموش اور اداس نظر آرہا تھا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ آسمان پر دبیز بادلوں کی وجہ سے ماحول پر ہر طرف پھیلی دھند سی چھائی ہوئی تھی، میں صحن کے بیچ میں رک گیا، اب کس سے کمرے کے بارے میں پوچھا جائے؟ اتنے میں ڈاک بنگلے کے اوپر کی ہٹ سے ایک معمر آدمی آتا دکھائی دیا، میں اس کے قریب آیا۔

"کوئی کمرہ ہے؟"

"سب چلے گا صاحب، سب چلے گیا، سب ——" وہ سب چلے گیا کئی بار دہرا کر آگے بڑھا، میں انتہائی مایوسی میں واپس مڑا، اتنے میں ڈاک بنگلے کے ایک کمرے سے نسوانی قہقہوں کی مترنم گونج سنائی دی —— وہی ایکٹریسیں ہوں گی۔ میں سوچنے لگا، لیکن یہ قہقہے لگانے کا کونسا موقعہ ہے؟ میرے منہ میں کڑواہٹ پھیل گئی۔

وہ رات میں نے گوردوارے میں گذاری، ٹریننگ یافتہ جوانوں میں ایک سردار لڑکا رنجیت بھی تھا اور وہ میرا آشنا سا تھا، ڈاک بنگلے سے مایوسی کی حالت میں لوٹ کر میں ایک دکان کے چھجے کے نیچے کھڑا تھا، اور چائے کے گھونٹ حلق سے اتار رہا تھا۔ وہ سردار بھی وہاں آگیا، باتوں باتوں میں اس نے مجھے رات گوردوارے میں گذارنے کا مشورہ دیا، یہ مشورہ مجھے معقول نظر آیا۔ اور میں نے فوراً چائے کا کپ حلق سے اتار لیا، اور بس کی طرف لپکا، ایک قلی پر نظر پڑی۔ اور بس کی چھت سے بستر اتروا دیا۔ غالباً وہاں یہی ایک بستر رہ گیا تھا۔ میں قلی کے آگے آگے چل رہا تھا۔ دکان کے قریب پہنچا، تو وہ سردار لڑکا میری رہنمائی کے لئے آیا۔ اتنے میں پیچھے سے آواز آئی: "سنیئے تو ـــــ"

وہی انسان تھا جو کچھ عرصہ پہلے سردار جی کے ساتھ ہمکلام تھا۔ پست قد کا ٹھگنا سا آدمی، بہت سے گرم کپڑوں میں ملبوس۔

"فرمایئے ـــــ"

"آپ نے کوئی اچھی جگہ دیکھ لی ہے کیا؟ اس کے لہجے میں تجسس تھا، عاجزی تھی!

"جی ہاں، بہت ہی اچھی جگہ ــــ" میں نے مسکراتے ہوئے کہا

"کہاں؟ کونسی ــــ" وہ بے چین ہو گیا،

"بھائی صاحب، میں رنجیت کے ساتھ گوردوارے جا رہا ہوں"

" OH I SEE "

اس کے " I SEE " میں مجھے طنز کی چبھن سی محسوس ہوئی، میں غصّہ میں آگے بڑھنے لگا۔ اتنے میں وہ پھر پکار اٹھا "سنئے" یہ کہکر وہ میرے قریب آیا۔ ہم نے یہاں دکان کے کمرے میں منجی لے رکھی ہے، لیکن کمرہ بہت سرد ہے، لکڑی کی دیواریں ہیں وہاں جن میں بڑے بڑے شگاف ہیں، سردار جی کہہ رہے تھے، کہ رات کو یہاں سخت سردی پڑے گی۔ کیا واقعی سخت سردی پڑتی ہے؟"

مجھے اب وہ دلچسپ آدمی نظر آنے لگا، اس کے لہجے میں خوف کی لرزش تھی، باہر سے آیا ہوا ہے۔ بیچارہ، لیکن اس سردی کے زمانے میں!

"میں پہلی بار کشمیر آرہا ہوں، مجھے یہاں کی سردی وردی کا کوئی علم نہیں ــــ"

"سردی تو بہت پڑے گی رات کو، آپ کے پاس گرم کپڑے تو

ہوں گے ہی ـــــ"

"کپڑے تو بس یہی ہیں، جو پہن رکھے ہیں ـــــ یہ دیکھیے دو قمیضیں ہیں، دو سویٹر، گرم سوٹ، مفلر، اور کوٹ ـــــ" وہ کپڑوں کی تفصیل بتا رہا تھا۔ اور میری توجہ گوردوارے کی طرف لگی ہوئی تھی، میں اس سے فوراً پیچھا چھڑانا چاہتا تھا، اس لئے میں نے کہا،

"بس ٹھیک ہے، رات کی ہی تو بات ہے ـــــ" میں بے معنی سی مسکراہٹ کے ساتھ رنجیت کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

کچھ دور چل کر رنجیت کے قدم رک گئے، اور اس نے قلی کو سڑک کے بائیں جانب ایک گلی کے اندر چلنے کا اشارہ کیا، سڑک کے کنارے پر ایک دو منزلہ عمارت کھڑی تھی، نئی بنی ہوئی معمولی سی عمارت، خاموش اور گمبھیر، ہم تینوں گلی سے ہوتے ہوئے عمارت کی دوسری منزل تک آئے، ایک ناہموار اور کچے راستے سے گزر کر، رنجیت نے عمارت کے ایک کمرے میں داخل ہو کر وہاں کے انچارج سردار جی سے بات کی۔ اور دوسرے لمحے ایک ادھیڑ عمر کے سردار جی سیاہ لوئی میں لپٹے ہوئے، اور ایک چھوٹا لڑکا دونوں رنجیت کے ساتھ نکلے۔ سردار جی نے کمرے کا دروازہ کھولا، اور مجھے اندر آنے کو کہا۔ میں کمرے کے اندر آیا۔

میں نے اطمینان کی سانس لی، اللہ کا شکر ادا کیا، ایک کشادہ کمرہ تھا یہ، دیواریں لکڑی کی بنی ہوئی۔ کچی مٹی کے بنے

ہوئے فرش پر دو پرانی سی بوسیدہ منجیاں پڑی تھیں، میں نے فوراً ایک منجی پر قبضہ کر لیا اور اس پر بستر بچھا دیا۔ اور رنجیت سے مخاطب ہوا۔

"بھئی، تمہارا بستر کہاں ہے؟"

"میں نیچے کے کمرے میں ٹھہرا ہوں، وہاں میرے دو اور دوست بھی ہیں" وہ قدرے لجاجت سے بولا۔

"اوہ، یہ بات ہے!" میں نے بستر سے گرم لوئی نکال لی۔ اور اسے اپنے جسم پر خوب لپیٹا۔

رنجیت چلا گیا، میں تنہا رہ گیا، اداس اور ٹھٹھرائی ہوئی تنہائی میں، میں کچھ دیر کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ کھڑکیوں میں شیشے لگے تھے، ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کھڑکی سے رات کو چھنتی ہوئی سرد ہوا آئے گی، لیکن اس کا کیا علاج ہے؟ میں لوئی اور لحاف میں سمٹ کر سو جاؤں گا، لیکن —— کمرے کی چھت؟ ارے یہاں تو چھت ندارد والا معاملہ ہے، اوپر ٹین لگی ہوئی ہے، اور ٹین کی چھت نما ہے، اچھا خاصا گرم بستر نہ ہو تو انسان کا جسم سردی سے جم جائے گا ——

میرے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی، میں تو یوں بھی سردی سے خائف رہتا ہوں، لیکن اور کہاں جا کر پناہ مل سکتی ہے؟ یہاں آ کر سر چھپانے کو جگہ مل گئی، میں اٹھا اور بائیں طرف کی دیوار میں لگے ہوئے

بند دروازے کے شیشے سے جھانکنے لگا۔ ساتھ والے کمرے کا حسن و تزئین دیکھ کر میں متعجب ہوا۔ اور فوراً سمجھ گیا کہ یہ کمرہ گرو جی کی عبادت کے لئے مخصوص ہے۔ سجا سجایا کمرہ، گرو جی اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کی فریم میں رکھی ہوئی تصویروں سے مزین، سارا کمرہ وقار، تقدس اور پاکیزگی کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، میں دیکھ ہی رہا تھا کہ دوسرے کمرے سے کسی نے ایک فلمی گیت اونچی آواز سے گانا شروع کیا ؎

یہ رات بڑی متوالی ہے، یہ رات بڑی متوالی

اچانک مجھے یاد آیا، یہ بس کا نوجوان سردار ہوگا، میں وہاں سے ہٹ گیا، اور سڑک کی طرف کھلنے والی بغیر شیشہ کی کھڑکی کے قریب آیا۔ میں نے باہر دیکھا۔ دور تک سڑک پر کوئی نہیں چل رہا تھا۔ سڑک خاموش تھی۔ اور ویراں ویراں سی نظر آتی تھی، سامنے سڑک سے دور اس پار پہاڑوں تک نشیب و فراز کا ایک لامتناہی سلسلہ چلا گیا تھا، اور ان سلسلوں میں دھند کی خوابیدہ لہریں انگڑائیاں لے رہی تھیں، آسمان پر دبیز بادلوں کا شامیانہ سا تن گیا تھا۔

اب شام ہونے والی تھی!

اداس اور سرد شام —!

میں دروازہ بند کر کے سڑک پر آیا۔ اور چند قدم آگے نکل آیا، سامنے ایک دکان میں کچھ لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے، میں بھی دکان کے اندر آیا، یہ ایک پرانی اور خستہ حال دکان تھی، جس کی لکڑی کی دیواروں

پر بے شمار دھبّے تھے، اور ٹیڑھی ٹیڑھی کالی لکیریں ابسٹریکٹ، چھت دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھی، ایک نیم تاریک غار' کچھ لوگ لوٹی ٹپوٹی کرسیوں پر بیٹھے تھے، کچھ لوگ بنچوں پر براجمان تھے، میں کونے کی خالی جگہ پر بیٹھ گیا، میں نے دیکھا سامنے وہی خواجہ صاحب تھے' دوشالہ اوڑھے ہوئے، ان کے چہرے پر بیزاری سے کئی گرہیں منجمد ہو چکی تھیں اور وہ ایک پرانا سا گندا مٹی کا حقہ گڑگڑا رہے تھے، ان کے پاس ہی تین اور آدمی تھے، جو وضع قطع سے ڈرائیور دکھائی دے رہے تھے دراز سیاہ مونچھیں، چہرے پر سختی اور کڑواہٹ، لباس کی لاپرواہی، وہ چائے پی رہے تھے، سگریٹ کے کش بھی لے رہے تھے، اور ساتھ ہی موسم کی خرابی پر غم و غصہ کا اظہار بھی کر رہے تھے۔

"کیا لاؤں جناب؟" میرے سامنے لپست قد کا ایک ادھیڑ آدمی کھڑا ہو گیا، اس کے لمبوترے چہرے کو دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا، اس مختصر سے قد کے ساتھ اتنا لمبا چہرہ؟ یہ تقابل؟ وہ پورا کارٹون نظر آ رہا تھا، شاید خالق ازل اس آدمی کی تخلیق کے وقت مزاحیہ موڈ میں تھا۔ اس نے پٹو کا لمبا سا پرانا کوٹ پہن رکھا تھا، جس کے بٹن غائب تھے، اور جس کی ایک جیب پھٹ کر مستقل ہینڈ لانگ کے پوز میں تھی، اس کی قمیض کے بٹن بھی غائب تھے، سینے کا کچھ حصہ بالوں کے ایک گچھے کے ساتھ باہر جھانک رہا تھا، سر پر خاکی رنگ کی ایک ڈھیلی ڈھالی سی پگڑی تھی، اس کی

ٹھوڑی پر چند بے ترتیب سے بال تھے۔ اور باقی چہرہ بالوں سے بے نیاز تھا۔ البتہ جھریوں سے آباد تھا، میں کچھ لمحوں تک اسے دیکھتا رہا، اس شکل وصورت کا بوڑھا میں نے آج تک کسی دکان یا ہوٹل میں نہ دیکھا تھا۔

"چائے لاؤ ــــــ"

"اچھا جی ــــــ" وہ اطمینان سے بولا، اور وہیں سے دکان کے اندرونی حصے کے باہر چھت کے نیچے مٹی کے مربع شکل کے بڑے چولہے کے قریب دوکاندار کو آواز دی،

"ایک چائے دو ـ"

"بنا کے دو خود ہی۔ اندھے ہو گیا ہے۔ دیکھتے نہیں روٹی بنا رہا ہوں ــــ" دوکاندار نے گرج کر غصے سے کہا،

عجیب آدمی ہے یہ دوکاندار بھی، اس دلچسپ آدمی سے ایسا سلوک کرتا ہے، بد مزاج"!

وہ خود ہی آگے بڑھ کر انہماک سے چائے بنانے لگا۔ اور میں دوکاندار کو دیکھ رہا تھا۔ مضبوط اور تنومند جسم والا ادھیڑ عمر کا آدمی، سر پر ملٹری والوں کا جگر پہنے ہوئے۔ جس سے اس کی گردن اور کان بھی ڈھکے ہوئے تھے، مختصر سی داڑھی، بھرا بھرا کتابی چہرہ، سختی اور تلخی لئے ہوئے، گھنی مونچھیں ہونٹوں پر سایہ فگن، سیاہ گہری آنکھوں پر سیاہ گھنی بھویں، بند گلے والا

بکشمیر پٹو کی اچکن پہنے ہوئے انتہائی پھرتی اور صفائی سے چپاتیاں توے سے اتار کر دہکتے ہوئے کوئلوں پر سینک رہا تھا۔

میں چائے پی رہا تھا۔ اور میں نے دل ہی دل میں تہیہ کیا کہ چائے پی کر ذرا سڑک پر کچھ دیر تک ٹہلوں گا، ممکن ہے کوئی جان پہچان کا آدمی نظر آئے، اور پھر اسی دکان سے کچھ کھا پی کر سو جاؤں،

"میں محمد بوٹے کو نقد پیسے ادا کر رہا تھا کہ جوشیلا نوجوان دوکان کے اندر آیا۔ اور آتے ہی دکاندار سے بولا۔

"کیوں جی دین محمد، منجی رکھی ہے میرے لئے؟"

"یہاں کسی کے نوکر تھوڑے بیٹھے ہیں جناب" دوکاندار جس کا نام دین محمد تھا، چپاتی سنبھالتے ہوئے بڑی بے نیازی سے بولا" میں نے کہا، اندر دیکھ لو صاحب، کوئی منجی رہ گئی ہو تو لے لو۔"

"میں نے رکھی ہے ایک منجی آپ کے لیے ــــ" محمد بوٹے بولا۔ پیالیاں صاف کرتے ہوئے، اور میلے سے خاکی دستار کے شملے سے ناک صاف کرتے ہوئے۔

"وہی جو دوپہر کو میں نے دیوار کے ساتھ رکھی تھی؟" نوجوان نے دکاندار کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی ــــ"

"چلو ٹھیک ہے، رات گذر جائے گی، رات کی بات ہی تو ہے

ہم نے کتنی راتیں تنہا قید میں گذاری ہیں ـــــ"

"قید میں ؟ ـــــ" خواجہ صاحب کے منہ سے حقّے کی نے چھوٹ گئی۔

"جی ہاں، .... ایجی ٹیشن میں دو بار قید کاٹی

"ایجی ٹیشن ـــــ؟ ہنہہ!" دوکاندار نے روئی ایک پر ڈالدی

"وہ راتیں بھی کیا ہوتی ہیں ـــــ"

"یہاں تو رات بھر ہی ٹھہرنا ہے۔ خوب مزے سے گزرے گی یہ رات، برادری ہو، تو جہنم بھی جنت ہے ـــ" خواجہ صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک آدمی بولے، جو وضع قطع، ہیئت اور لباس سے کسی گاؤں کے ذیلدار دکھائی دے رہے تھے۔

"ہم نے یہاں پر آج تک کتنی ہی راتیں گذاری ہیں، کیوں دین محمد یاد ہے۔؟"

"اب کیا کیا چیز یاد رہے صاحب؟" دین محمد نے چڑ کر کہا، "کتنے لوگ آتے ہیں، کتنے لوگ جاتے ہیں، کون کس کو یاد رکھے؟"

"چھوڑیئے اس بات کو ـــــ کوئی خبر سنی؟" خواجہ صاحب نے حقّے کا کش لے کر جوشیلے نوجوان سے پوچھا۔

"یہی کہ کل صبح کالنوائے نکلے گی ـــــ"

"یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے، ـــــ"

یہ کہکر خواجہ صاحب پھر حقّے کے دھوئیں میں ڈوب

گئے، اور نوجوان دکان کے عقب میں اندر والی تاریک کوٹھری میں گھس گیا، جہاں اور لوگوں نے بھی سونے کے لئے منجھیاں لگا رکھی تھیں۔

اور میں دکان سے اتر آیا۔

میں سڑک پر دور تک چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ، دکانیں بند ہو رہی تھیں، صرف دور دور کھانے پینے کی معمولی سی دکانوں میں کچھ چہل پہل تھی، کچھ رونق، دور دور تک خاموشی تھی، اور اس اجنبی، ویران اور سرد پہاڑی علاقہ پر رات کی تاریکی تیزی سے قدم بڑھا رہی تھی۔

صبح میری آنکھ اس وقت کھلی، جب گوردوارے کے دروازے پر دو تین لڑکے زور زور سے باتیں کر رہے تھے، میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، آٹھ بج چکے تھے، میں جلدی سے بستر سے نکلا، رات کو سردی کی شدت سے میں کئی بار جاگ پڑا تھا، حالانکہ میں دو گرم قمیض اور سویٹر پہن کر سویا تھا۔ اس وقت بھی خاصی سردی پڑ رہی تھی۔ میں نے سب سے پہلے بستر کو باندھ کے رکھ دیا۔ اور لوئی اوڑھ کر بازار کی طرف گیا۔

مسجد سے ملحق پرانے اور گندے سرد خانے میں منہ ہاتھ دھو کر میں سیدھا دین محمد کی دکان گھسا۔ دکان خالی تھی، صرف خواجہ صاحب اندر بیٹھے تھے۔ اور وضعداری سے چائے نوشی میں مصروف تھے۔

میرے لئے بھی چائے آگئی

"یہ سب لوگ کہاں غائب ہو گئے ہیں؟" میں نے محمد بوارے سے

پوچھا

"افسر لوگوں سے ملنے گئے ہیں"

"کیوں؟"

"راستے کا پتہ معلوم کرنے کے لیے، بسی گر گئی تھا نا کل؟"

"عجیب ہیں یہ لوگ بھی، بھاگے جا رہے ہیں، مصیبت کو بھی تماشا بناتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا ——" خواجہ صاحب غصہ میں بڑبڑائے

"کل راستہ تو ٹھیک تھا، میرا مطلب ہے۔ ٹھیک ہو گیا تھا ——"

"گارنٹی تھوڑی دی گئی تھی، —— مٹی کے چولہے کی دیوار دل پر بھیگا کپڑا پھیرتے ہوئے دین محمد نے کہا،

"میں نے کہا، یہ پہاڑی راستے بڑے عجیب ہوتے ہیں، بڑے ضدی —— ہاہاہا ——" اچانک وہ ہنس پڑا۔

میں نے دیکھا، اس کے مضبوط جبڑے کھل گئے، اس کے بڑے بڑے سفید دانت چمک کر رہ گئے، مجھے محسوس ہوا جیسے اچانک کڑک کے ساتھ بجلی چمکی ہو۔ بھیانک سی لگی مجھے اس کی یہ ہنسی۔ جیسے وہ ہم سب مصیبت زدوں پر طنزیہ قہقہہ لگا رہا ہو۔

میں زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

"لعنت ہو ایسے راستے پر ——" خواجہ صاحب سے رہا نہ گیا۔ ان کے نیلے سے ملبوتر ے چہرے کی بہت سی گرہیں نفرت سے تن گئیں ان کی مونچھیں پھڑپھڑائیں،

"ہم بھی تو لعنت ہی بھیجتے ہیں صاحب، لیکن بڑے ڈھیٹ ہیں یہ پہاڑ ــــ"

دین محمد نے اطمینان سے کہا، اور فوراً اپنے نوکر پر برس پڑا۔

"خلیل"

"جی، جی ــــ"

"سردی سے ٹھٹھر کر تو نہیں رہ گئے، یہ چیزیں ہٹاؤ یہاں سے، ڈھیر لگ گیا ہے چیزوں کا، اندر سے لکڑی لے آؤ، برتن دھو لو۔ چاول صاف کر لو، میں نے کہا، میرا منہ کیا تک رہے ہو، کام کرو کام، یہاں دکان ہے۔ کوئی دیوان خانہ نہیں ــــ"

میاں خلیل سنتا رہا، ہاتھ میں دو پیالیاں لیے ہوئے منہ کھولے ہوئے، پلکیں جھپکاتے ہوئے، اور اس وقت تک کھڑا سنتا رہا جب تک دین محمد نے بھرپور جھاڑ بتائی، اور جب دین محمد خاموش ہو گیا، اور دوسرے کام میں لگ گیا، میاں خلیل آگے بڑھا، صبر و سکون کے ساتھ، اور اس نے اس انداز سے چیزیں سمیٹنا شروع کیں، جیسے ابھی دین محمد کے منہ سے انگارے نہیں، پھول برسے تھے۔ اس کے چہرے پہ ایک شکن بھی نہ ابھر آئی تھی۔

میں دل میں دکاندار کے خلاف عجیب سی نفرت لیے ہوئے دکان سے نیچے اترا، اور سڑک پر چلنے لگا۔

بادل آج بھی آسمان پر چھائے ہوئے تھے، اور کہیں سے

دھوپ کی ایک ہلکی سی کرن کے نکلنے کا امکان بھی نہ تھا، سرد ہوا کے جھونکے چل رہے تھے، میں اس چھوٹے سے بازار سے چل رہا تھا، دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں، دکاندار زیادہ تر وہ لوگ نظر آ رہے تھے، جو وادی کے اس طرف بود و باش رکھتے ہیں، جموی انداز میں پگڑیاں باندھے ہوئے، پیتل کے حقّے گڑگڑاتے ہوئے، خریداروں سے الجھتے ہوئے، چیزوں کی نمائش کرتے ہوئے۔ کچھ دکاندار گرم لوئیاں اوڑھے ہوئے شاید موسم کی بے وقت کی خرابی پر سوچ رہے تھے، کھانے پینے کی چند دکانوں پر سرداروں کا ہجوم تھا، ہندوؤں کی دکانیں بھی تھیں، اور چند دکانیں مسلمانوں کی بھی، اس مختصر سے بازار میں زیادہ تر.... پنساریوں، غلّہ داروں اور سبزی فروشوں کی دکانیں تھیں، بازار کے کونے پر دوا فروش کی ایک معمولی سی دکان تھی۔ دکان کے اندر دیوار کے ساتھ لگی ہوئی بغیر شیشوں کے پرانی سی الماریوں سے دوائی سے بھری ہوئی کچھ شیشیاں اور کچھ خالی بوتلیں جھانک رہی تھیں، اور دکاندار مضبوط بازوؤں پر آستینیں چڑھائے ہوئے، ہاتھ میں ایک لمبا اوزار سنبھال رہا تھا اور سامنے فرش پر ایک عمر رسیدہ دیہاتی منہ کھولے یوں بیٹھا تھا، جیسے دکاندار اوزار سے اس کا دانت نہیں نکال رہا تھا، بلکہ ایک گُرزِ گراں سے اس کی جان لینے والا تھا،

میں چلتا رہا۔ ڈاکخانہ سے آگے گذر گیا۔ اب بائیں جانب سڑک کے کنارے مال گاڑیاں ایک لمبی قطار میں ایستادہ تھیں، یہ

قطار شاید مقامی چک پوسٹ تک چلی گئی تھی، کچھ ڈرائیور بے تحاشہ ہیٹر یاں پھونک رہے تھے، اور کچھ ڈرائیور اور کلینر مل کر اسٹوو پر چاول پکانے میں مصروف تھے۔

"آداب عرض!"

میں نے نظر اٹھائی، داہنی جانب ڈاک خانے کی طرف سے پنڈت جی آتے دکھائی دئے۔ وہ زرد رنگ کی لوئی میں جسم کو چھپائے ہوئے ٹانگوں میں کشمیری پٹو کا چست پاجامہ پہنے ہوئے تھے، میں نے محبت سے آداب عرض کا جواب دیا، اور پوچھا کہ وہ کہاں سے آرہے تھے۔

"میں ڈاکخانے سے آرہا ہوں، میں گیا تھا تار دینے کے لئے، لیکن ـــــ لیکن تار نہیں دیا، تار بابو نے کہا، بے کار ہی ہے تار دینا، میں نے بھی سوچا مفت میں پیسہ جائے گا، آج کا تو آئے جائے گی، تار بابو نے کہا شام تک سب لوگ گھر پہونچ گئے ہوں گے ـــــ پنڈت جی نرم لہجے میں، جیسے گنگنا رہے تھے۔

"ٹھیک ہی تو کہا ـــــ"

"ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ چلئے، آگے چلتے ہیں، میں نے سنا ہے، دو بجے راستہ کھل جائے گا ـــــ"

"دو بجے؟"

"جی ہاں۔ دوپہر کا کھانا بھی یہیں کھانا پڑے گا، آب و دانہ کی بات ہے ـــــ"

"بہت خراب کھانا ملتا ہے ۔۔۔"
ایک تو خراب، دوسرے یہ دوکاندار مسافروں کا خون پیتے ہیں، ایک ہلکی سی چپاتی کے تین آنے لگاتے ہیں۔ اور سبزی کی پلیٹ آٹھ آنہ ۔۔۔ آپ ہی بتائیے کہاں کا انصاف ہے یہ! لوگ بڑے بے رحم ہوتے جا رہے ہیں۔ بھگوان ہی رکشا کرے ۔۔۔" پنڈت جی کے لہجے میں تلخی تھی، ان کی غلافی آنکھیں باہر نکل آئیں۔

ہم آگے چلے تو سامنے سے شملے سے آیا ہوا آدمی اور اس کی بیوی آ رہی تھی، عورت کے کندھے پر اس کا نوزائیدہ بچہ سر رکھ کے سو رہا تھا۔ اور مرد کی گود میں اس کا دو یا تین سالہ بچہ تھا، میاں بیوی دونوں کے چہرے زرد تھے، آنکھیں بے خوابی سے سوجھی ہوئی، ان کی صورت میں تھکن اور اداسی تھی۔

"کہیے پریم جی، کیسی گذری رات؟" پنڈت جی نے کہا۔
"مہاراج، رات گذاری جوں توں کر کے، لیکن نیند آئی نہیں، بچے کی طبیعت بھی خراب تھی ۔۔۔" اس کے لہجہ میں احساس بیچارگی تھا اور ندامت کا ایک بوجھ سا تھا۔ یہ خواہ مخواہ شرمندگی سی محسوس کر رہا ہے۔ یہ رات تو سبھوں کے لئے بھاری تھی، سبھوں نے خدا خدا کر کے ہی یہ رات کاٹی ہے۔ سب لوگ تکلیف میں رہے اور پھر یہ عارضی تکلیف۔

ہم آگے بڑھے، مجھے رہ رہ کر پریم جی کے احساس بیچارگی اور

اس کی بیوی کے زرد اور پھٹے ہوئے ہونٹوں کا خیال آرہا تھا،
ہم بازار کے آخری سرے تک آ گئے تھے، اور چیک پوسٹ
پر دور ہی سے نظر پڑتی تھی، جہاں ایک ملٹری والا بندوق لئے کھڑا
تھا، چیک پوسٹ کے اس طرف سڑک کے دائیں کنارے پر لوگوں
کی ایک بھیڑ جمع ہو گئی تھی، کچھ لوگ کھڑے تھے، کچھ درختوں کے تنوں
کے ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ سبھوں کی نظریں نیچے بل کھاتی ہوئی سڑک
کو کھوج رہی تھیں، نہ جانے یہ لوگ کیا دیکھ رہے ہیں، میں پنڈت
جی کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ نیچے پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر، بہت دور تک
کہیں کہیں سڑک ایک تیلی سی لکیر کی صورت دکھائی دے رہی تھی،
کہیں کہیں یہ لکیر پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپ جاتی، اور پھر میلوں
تک اس کا کہیں نشان بھی نظر نہ آتا، میری حیرانگی اب بڑھ رہی تھی،
یہ لوگ اپنے ٹھکانوں اور قیام گاہوں کو سویرے ہی چھوڑ کر
یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ اور اتنی بے تابی اور اشتیاق سے دیکھ رہے ہیں
لیکن یہ دیکھ کیا رہے ہیں؟ مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا، وہ جگہ تو بالکل
نظر نہیں آتی جہاں بستی گھری ہے۔ اور کام لگا ہوا ہے۔ وہ تو بہت
سے میلوں کے فاصلے پر ہے۔ پھر یہ انبوہ آوارہ گاں یہاں کیوں اور
کاہے کو جمع ہوا ہے؟ در اصل، یہ واقعہ انسان کی ازلی بے تابی اور
بے صبری کا ایک مظہر ہے۔ انسان کسی حال میں مطمئن نہیں رہ سکتا۔
جب بھی وہ خراب حالات میں گھر جائے، وہ کسی نہ کسی صورت میں بغاوت

یا فرار کی راہ نکالتا ہے ——— یہ انسان کی فطرت ہے۔!

یہاں وقت خراب کرنا بے کوئی ہے بادشاہو ——"

اچانک سردار جی کی آواز لہرائی، وہ مجھ ہی سے مخاطب تھے، ان کے بڑے چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی چمک رہی تھی، اور بڑی بڑی سرمئی آنکھوں میں روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں، یہاں سے تو کچھ نظر نہیں آتا" میں نے کہا۔

"بس وہ ——— وہ، وہاں، ذوریل ڈوزر کام کر رہا ہے" پنڈت جی بولے اور فوراً ان کی غلافی آنکھیں دور راستوں کے پیچ وخم میں کھو گئیں،

میں نے انہیں چونکا دیا۔

"پنڈت جی، یہ راستے بھی کتنے خراب ہیں، ذرا بارش ہوئی، اور بس گھر گئے"

"لیکن اب یہ سڑکیں مضبوط بنائی جائیں گی، باہر سے انجنیر بلائے جا رہے ہیں۔ اور ——— اور میں نے سنا ہے ان پہاڑوں سے سرنگیں نکالی جائیں گی، اور پھر یہ مصیبت ہی نہ رہے گی۔ پنڈت جی اپنی معلومات بیان کر رہے تھے۔ لیکن میرے سوا کوئی نہیں سن رہا تھا۔

سب انہماک سے دیکھ رہے تھے!

میں پھر دیکھنے لگا۔ لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا، شاید میری عینک کا نمبر بدل گیا ہو، دو سال تک یونیورسٹی میں جان توڑ محنت اور لگاتار مطالعے سے تو میری EYESIGHT اور بھی کمزور ہوئی ہو گی۔

لوگ دیکھتے رہے، وہ غالباً اس لئے دیکھتے رہے کہ سب لوگ دیکھ رہے تھے، میں چپ کھڑا رہا۔ اور سوچتا رہا یہاں کے لوگ کس قدر تماشا پرست ہیں!

اور جب ہم واپس چلنے لگے، ایک مال گاڑی کے قریب ایک مجمع میں جوشیلا نوجوان کہہ رہا تھا۔

"دو بجے کا لوا لے چلے گی، ابھی ابھی ڈی آئی صاحب نے مجھے کہا میں ان سے ملنے گیا تھا" میں نے کہا لوگ بیچارے پریشان ہیں انہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا" ہم نے تحریک میں ساتھ کام کیا ہے۔ انہوں نے کہا دو بجے راستہ کھل جائے گا ـــــــ" وہ زور زور سے فخریہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ اور ارد گرد کے ایتادہ لوگ اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ اور اس کی تقریر سننے لگے۔

ہم کچھ دور آگے چلے، سامنے سے اچانک انور صاحب نمودار ہوئے۔ سفید رنگ کی ریشم کی مانند ملائم لوئی میں لپٹے ہوئے سر پر سیاہ رنگ کے چمڑے کی ٹوپی ــــ ان کے چہرے پر تبسم تھا۔
" بھئی رفیق صاحب، آپ تو کل سے نظر ہی نہ آئے، کہاں

رہے آپ ؟"

" بس جی سر چھپانے کو ایک جگہ ملی اور رات کاٹ دی ــــ"

میں نے بات کاٹنے کے انداز میں کہا، لیکن انور صاحب کب بخشنے والے تھے،

" ہم نے مزے میں رات گذاری، سردی بالکل نہیں لگی، خوب نیند آئی۔ ڈاک بنگلے کے ہال میں تھے ناہم ؟ آپ شاید اوپر ڈاک بنگلے ہی تھے ــــ"

" نہیں تو ــــ"

" پھر کہاں غائب رہے ؟"

" بھئی میں گوردوارے میں تھا ــــ"

" گوردوارے میں ؟ ــــ" انہوں نے تعجب سے آنکھیں مٹکائیں"

اور فوراً خاموش ہو گئے۔ . . .

" اچھا کیا آپ نے ' بھگوان کے گھر رہے " پنڈت جی بولے"

میں، تو ایک دوکان میں ٹھہرا، ایک گندے، تاریک اور بدبودار کمرے میں اور دکاندار نے ایک روپیہ لے لیا ــــ"

" بادشاہو، سفر میں گرو جی اور بھگوان کے دوارے جانا ہی اکل مندی ہے،

کیوں، جناب ؟

"اور کیا ــــ ہمیں تو وہاں اطمینان سے سوتا رہا ــــ"
میں نے جھوٹ بولا۔

انور صاحب مجھے خاموش نظروں سے دیکھ رہے
تھے۔ سب لوگ خاموش ہوئے۔

اتنے میں سامنے سے ایک جیپ کار بھاگتی ہوئی آئی، ہمارے
قریب ہی جیپ رکی، اور اس میں سے ایک وردی پوش سردار جی اترے،

"ست سری اکال ــــ" ہمارے سردار جی نے آگے بڑھ
کر نعرہ لگایا۔

"ست سری اکال ــــ"

"بادشاہو، سڑک کی تاجہ کھبر سناؤ ــــ"

"کبھی، کام لگا ہوا ہے ــــ کام لگا ہوا ہے، ابھی تو کچھ نہیں
کہا جا سکدا، دو تین بجے تک شاید ٹھیک ہو ــــ ویسے
DONT WORRY سب ٹھیک ہو گا ــــ"

سردار جی گورے چٹے آدمی ٹریفک کے آفیسر تھے، اور دائیں
ہاتھ میں چھڑی گھماتے ہوئے آنکھیں بھی تیزی سے گھما رہے تھے۔
ان کے لہجے میں تیزی تھی،

لوگ ارد گرد سے دوڑ کر ہمارے گرد جمع ہو رہے تھے۔ اور
سردار جی کی طرف امید و بیم کے کانپتے ہوئے جذبات سے دیکھنے
لگے۔"

"ایک عرض ہے جناب" اچانک پنڈت جی بولے
"کیا ہے ـــــ بولو ـــــ بولو ـــــ جلدی بولو ـــــ"
"آپ نے وہاں خود سڑک دیکھی ہے؟"
"تو کیا میں وہاں جھک مارنے گیا تھا؟ ـــــ سردار جی تنک کر بولے ـــــ" بھئی ایسی گہری ہے کہ دور دور تک سڑک کا پتہ ہی نہیں چلتا، اب نئی سڑک بن رہی ہے۔ کل شام تک کام لگا رہا۔ اب بھی کام لگا ہوا ہے ـــــ'

لوگوں کے چہروں پر فکر مندی کے بادل آتے رہے، جاتے رہے،

سردار صاحب ـــــ! انور صاحب معتبرانہ لہجے میں بولے۔
لوگوں کی نظریں اب ان کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔
"آپ کا ذاتی خیال کیا ہے سڑک کے بارے میں ـــــ؟
"بھئی ہمارا خیال کیا ہو سکتا ہے ـــــ" سردار جی قدرے 'FLATTER' ہوئے۔

"اندازہ ہے، راستہ بن جائے گا، ضرور بن جائے گا۔ لیکن عارضی طور پر، سمجھے؟"

یہ کہکر وہ چھڑی اور آنکھیں ایک ہی رفتار سے گھماتے ہوئے آگے بڑھے۔
سب لوگ منتشر ہو گئے ـــــ

سردار جی کی باتوں پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے، دلوں میں امید کی ہلکی سی روشنی لئے ہوئے۔

دو بجے تک انتظار کا عالم کتنا کرب آمیز تھا! ایک ایک لمحہ کوہ گراں تھا، اردو غزل کے شاعر کو سنگدل محبوب کے انتظار کا کرب اتنا روح فرسا نہیں رہا ہوگا، جتنا یہ ہمارے لئے تھا ــــــ اور پھر ہم دو بجے کے بجائے تین، چار، اور پانچ بجے تک انتظار کرتے رہے! ــــــ

دین محمد کی دکان میں انور صاحب کے ساتھ کھانا کھا کر ہم ڈاک بنگلہ کی طرف جا رہے تھے کہ پرویز کی صورت نظر آئی۔ اور پھر پرویز ہمیں اپنے ساتھ لے گیا ڈاک بنگلے کی طرف ــــ یہ چند گھنٹے جو ہم نے لوگوں کی کمر کے گذارنے تھے ہی!

ڈاک بنگلے میں ایک اور دنیا تھی، حسن اور مسرت کی دنیا، رنگینیوں اور رعنائیوں سے معمور!

اس وقت سامنے چھوٹی سی پارک میں کئی کرسیاں لگی تھیں فرش پر خودرو سبزہ کہیں زیادہ اُگا ہوا تھا، کہیں کم کم۔ اور کہیں بالکل غائب ہو چکا تھا، باغ کے بازار کی طرف لگے ہوئے بنگلے کے قریب چیل کے درخت تھے۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے!

مدراس سے آئی ہوئی ایکٹریس نئی نویلی دلہنوں کی طرح

آراستہ و پیراستہ بیٹھی تھیں۔

"مسٹر پرویز!" ایک نسوانی آواز خواب آگیں نغمے کی طرح لہرائی، اور دوسرے لمحہ ایک ایکٹرس اٹھی، نیلے رنگ کا اسکرٹ اور مہندی رنگ کی سویٹر لگائے ہوئے، ایک بجلی سی چمکی، لہرائی، یہ وہی لڑکی تھی، جو اوروں کی نسبت کم عمر دکھائی دے رہی تھی۔

"یس میڈم!" پرویز چہکا۔

"WHAT IS THE LATEST NEWS"

"GOING BY THREE"

"REALLY"

"HOPE SO" پرویز ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ اور لب و لہجہ اور تلفظ میں کسی انگریز سے پیچھے نہیں، بلکہ دو قدم آگے ہی تھا، میں نے ہنسی روک لی۔ اور میں اس لڑکی کے تمتماتے چہرے پر غازے کی دبکتی ہوئی موٹی تہوں کو دیکھ رہا تھا۔ اگر یہ تہیں کھرچ دی جائیں تو چہرے کا اصلی رنگ سامنے آئے گا، اور اگر یہ نقاب اٹھ گئی تو ـــــــ؟

تو اس نقاب کے نیچے چہرے کی وہی تھکن اور افسردگی ہوگی جو اس وقت انتظار نے سب کے چہروں پر پیدا کی تھی، انتظار کی کوفت سے ہر آدمی نالاں تھا، لیکن یہ عورتیں؟ ان کے مرمریں رخساروں پر شباب کی بے فکری تھی، ان کے رنگوں میں ڈوبے

ہوئے جسموں کو دیکھ کر آسودگی اور بے غمی کا احساس ہوتا، یہ تضاد الجھن کا باعث تھا ——— کتنی الجھنیں! یہ الجھنیں ذہنی اور فکری قوتوں میں زہر پھیلاتی ہیں۔ یہ زہر ہر رگ و ریشے میں سرایت کر جاتا ہے اور وہ لڑکی ہماری طرف کافر تبسم کے چند پھول بکھیر کر ادائے دلربائی سے جسم کو رقص کی سحرکار کسمساہٹ کے ساتھ بل دیکر مڑی، اور کبک دری کی سبک رفتاریوں کے ساتھ لیٹسٹ نیوز سنانے لگی۔ اکہرے بدن والی شاخِ گل کی طرح لچکنے والی لڑکی لہرا کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ احساس مسرت سے اس کے ہونٹ گلاب کی نرم و نازک پتیوں کی طرح کھل اٹھے، اور ہونٹوں کی گلابی میں موتیوں کی لڑی دمک اٹھی اور تیسری نے کرسی پر ہی اپنے خوبصورت جسم کے بوجھ کو سنبھالتے ہوئے نعرہ لگایا۔ اپنی نغمہ بار آواز میں:

"او فائن ——— !"

اور میں نے پرویز سے کہا

"بھئی ان لوگوں سے تم نے خوب دوستی گانٹھ لی ہے"

ہم پرویز کے کمرے کے باہر برآمدے پر بیٹھ گئے، ابھی پرویز نے میری بات کا جواب بھی نہ دیا تھا کہ اس کے بغل والے کمرے سے وہ عورت نکلی ——— خاموش اور سوگوار حسن لئے ہوئے ——— وہی عورت جس کو میں نے کل دوپہر تک لبس میں دیکھا تھا۔ جس

کی خاموش اور افسردہ جوانی کو دیکھ کر مجھے عہد وسطیٰ کی کسی رنگ محل میں اسیر شہزادی کا خیال آتا، جو روح کے حسین پردوں میں، رومانوی کرب چھپائے، منقش اور رنگین دریچوں سے، زندگی کے سنسان رہگزاروں پر خوابوں کی منزل کے لئے بھٹکتی ہے ـــ یہ بھٹکی ہوئی روح ایک حسین پیکر شباب میں ڈھل کر کل میرے سامنے تھی ـــ یہ میری ہمسفر تھی،۔

اور پھر اچانک وہ نہ جانے کہاں نکل گئی تھی، کہاں وہ چھپ گئی تھی۔ خیالوں کے کن رنگین دھندلکوں میں تحلیل ہو گئی تھی ـــ"

میں اس کو بھول چکا تھا اور وہ میرے ذہن سے اتر چکی تھی، اور اس وقت وہ سامنے کھڑی تھی، جک اور کوٹ پہنے ہوئے۔ سوتی کپڑے کی لال ساڑھی میں ملبوس، بال گردن پر ایک گھنی چوٹی میں گندھے ہوئے۔ الجھے خشک بال، چہرے کے خدوخال میں صبر اور جدائی جھلکتی ہوئی، اداسی اور خاموش جوانی۔ ایک چیز جو اس کے چہرے کے حسن کی ترتیب میں کھٹکتی تھی، وہ اس کی ناک تھی، اس کی بہت زیادہ لمبی ناک دیکھ کر کمخواب میں ٹاٹ کے پیوند کا خیال آتا ـــ!

"کچھ سنا آپ نے؟" اس کی نظریں جھک گئیں۔

"جی ہاں، فریش نیوز لائے ہیں، بیٹھئے آپ ـــ" پرویز نے ملائمیت سے کہا اس کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ آگئی۔

وہ بیٹھی نہیں، کھڑی رہی، ایک سروِ آزاد کی طرح، اور

یا بائیں ہاتھ سے ساڑھی کے پلو کو کھینچتی رہی، میں نے پھر ایک بار اس کے چہرے کی طرف دیکھا، مگر اس کی دراز پلکیں اٹھ گئیں، میں نے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ ان آنکھوں میں نرمی تھی، [illegible]ت تھی، اور معصومیت تھی، اس کے بھرے بھرے جسم کی نظر فریب گولائیاں اور قوس واضح تھے۔ اس عورت کے جسم کے ہر ہر حصے میں ایک مکمل عورت جھلکتی ہے۔ میں سوچنے لگا۔ انور صاحب سانس روکے اسے یوں دیکھ رہے تھے، جیسے ان کی غزل کا کھویا ہوا حسن مجازان کے سامنے جلوہ گر تھا۔ ماضی کے دھندلکوں سے جوانی کے خوابوں کی شہزادی ابھر آئی تھی، وہ اسے اس محویت سے دیکھ رہے تھے جیسے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی آنکھیں انہیں دھوکا نہیں دے رہی ہیں۔ لیکن میری گھبراہٹ بڑھ رہی تھی۔ ایک اجنبی عورت کو یوں گھورنا کتنی غیر مہذبانہ حرکت ہے۔ لیکن شاید اس میں انور صاحب کا قصور بھی نہ تھا،

وہ عورت ___"

"اب تو بس گھنٹے بھر کی بات ہے، چار بجے ہم ٹوت کو الوداع کہیں گے ___"

پرویز مسکرا کر کہہ رہا تھا،

"اب تو یہاں بہت بور ہو گئے، جتنی جلدی یہاں سے نکلیں ٹھیک ہے ___"

یہ کہکر وہ ہلکے ہلکے مترنم قدم اٹھاتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں چلی گئی، اور پرویز نے کہا۔

"بھئی آپ اسے نہیں جانتے؟ میوزک کی ٹیچر ہے، کماری جی، سب جانتے ہیں اسے،

"ریڈیو پر بھی گاتی ہے ——"

"اچھا تو یہی وہ کماری ہے ——" انور صاحب چونکے "بڑی سریلی ہے اس کی آواز" درد سے معمور، دل میں اترتی ہے، اس کی آواز، خاص کر جب وہ للہ دت اور حبہ خاتون کی غزلیں گاتی ہے تو میں اپنی غزل لکھنا بھول جاتا ہوں، وہ غزل

سہ چانہ برہ تل رادم راتری آواز واڈی نو

اگر سننا ہو، تو اسی کی زبانی سننا چاہئے، آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے ——"

انور صاحب بہکے چلے جا رہے تھے، اور میں اس عورت کے بارے میں کچھ اور سننا چاہتا تھا۔ جذبۂ تجسس میرے دل میں کروٹیں لے رہا تھا۔

"اس کی کہانی بڑی TRAGIC ہے ——" پرویز نے سگریٹ جلا کر بات جاری رکھی۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" انور صاحب نے کرسی قریب کھینچ لی۔

"اس کا چہرہ ہی ایک یونانی المیہ کے درد اور گہرائی کا پتہ

دیتا ہے" میرے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ اور پرویز سنا رہا تھا:
" یہ موسیقی کی محفلوں میں گایا کرتی تھی، اور پھر اسے ریڈیو سے کنٹریکٹ ملنے لگے، باپ چپراسی ہے۔ اس کا بادھو جو، میں جانتا ہوں اسے، پرانی وضع کا پنڈت۔ سیدھا سادھا، بلاناغہ منہ اندھیرے پربت جانے والا، اور بات بات پر لمبا قہقہہ کھینچنے والا، آفس سے لوٹ کر ہی رات گئے۔۔۔۔ تک پوجا پاٹ میں مگن رہنے والا پنڈت جو کچھ کماتا رہا، اپنی اکلوتی بیٹی پر خرچ کرتا رہا، اور پھر کیا ہوا؟ ——" پرویز نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ دی، اور انور صاحب کو ایک اور سگریٹ پیش کیا۔

اتنے میں برآمدے کے کونے سے قدموں کی چاپ سنائی دی، میں نے دیکھا کہ بلیو رنگ کے ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس، ریشمی ٹائی لگائے ہوئے ایک آدمی آ رہا تھا۔ سر پر انگریزی فیلٹ، کالا چشمہ پہنے ہوئے پالش سے چمکتا ہوا بوٹ، اس کی گھنی مونچھیں اس کے فراخ بھرے سے چہرے پر بڑی IMPRESSIVE لگ رہی تھیں، وہ قریب سے گذرا، اور ہماری طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی۔

"کون صاحب ہیں یہ؟" انور صاحب نے پرویز سے پوچھا، سرگوشی کرتے ہوئے،

"میں جانتا نہیں ہوں اسے، انجنیر ہے کوئی، آسمان پر دماغ ہے۔ اس کا کسی سے بات بھی نہیں کرتا ——"

"بھئی جانے دیجیے اسے، آپ اصل موضوع سے ہٹ گئے ـــــ"

میں نے کہا۔

"ہاں تو کماری گریجویٹ ہوئی، اور پھر مادھو کول کو اس کی شادی کی فکر کھانے لگی ـــــ"

"ایک بات بتایئے پرویز صاحب ـــــ" انور صاحب بیچ ہی میں بول اٹھے،

"کیا؟"

"آپ کو انٹی انفاریشن ـــــ"

"بھئی یہ ہمارے ہی محلے میں رہتے ہیں نا؟"

اتنے میں سامنے پارک میں شور بلند ہوا۔ ہم تینوں چونکے لوگ، پارک کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ اور کمروں کی طرف بھاگ رہے تھے، ایکٹریسیں بھی تالیاں بجانے لگیں اور کمروں کی طرف دوڑنے لگیں۔

"شاید راستہ ٹھیک ہو گیا ہے"

"جی ہاں! ایسا ہی لگتا ہے۔"

"ہمیں تو بھاگنا چاہیے"

"ہاں ہاں سامان وغیرہ لے جاتا ہے۔"

"جلدی چلیے، جلدی چلیے ـــــ"

ہم اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ سامنے سے وہی انگریز نما نوجوان آیا۔

اور ہمارے سامنے خود ہی کہہ کر آگے بڑھا۔

"میں ڈی، ای سے ملا ہوں، میں نے ٹاک کی، سب ٹھیک ہوا۔"

ہم فوراً اپنے اپنے کمروں کی طرف دوڑنے لگے۔

کماری کی کہانی بکھر چکی تھی ــــــ!

سڑک پر لوگ جمع ہو گئے تھے، اور بسوں کے گرد منڈلا رہے تھے، کچھ لوگوں نے سامان بھی لایا تھا۔ لیکن ڈرائیور اسی بات پر ضد کر رہے تھے کہ سامان ابھی چھت پر نہیں جائے گا۔ ابھی کوئی مصدقہ اطلاع نہیں آئی ہے۔ محض سنی سنائی بات ہے۔

"بھئی ایک گاڑی چلی گئی ــــــ" ایک آواز آئی۔

"کہاں گئی، جہنم میں ــــــ" ڈرائیور چلایا، اور کلینر آنکھیں مٹکاتا ہوا، سگریٹ پھونکتا ہوا ایک قریبی دکان میں داخل ہوا۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، میں تھوڑی دیر رکا رہا۔ تاکہ صحیح بات معلوم ہو سکے، لیکن انور صاحب سڑک کے نیچے تیز تیز دوڑنے لگے، اور جب ان کے یہ الفاظ میرے ذہن میں دوبارہ ابھرے، میں بھی دوڑنے لگے۔

"یہ سالے اصل بات کہاں بتائیں گے، آخری وقت ہارن بجایا، اور چلتے بنے ــــــ"

واقعی ان ڈرائیور لوگوں کی بات پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، عجیب مخلوق ہیں یہ تو، چڑچڑے، گھمنڈی، بات بات پران

مونچھیں پھڑکتی ہیں، بات بات پر یہ مغلظات بکتے ہیں، رات دن ٹھرے کی بوتلوں کو سینے سے لگائے رہتے ہیں نہ اور پھر کتنے انسانوں کی قیمتی زندگیاں ان کے رحم وکرم پر ہوتی ہیں، ان کی معمولی سی غفلت یا فروگذاشت کتنے انسانوں کو موت کی تاریکیوں میں ڈھکیل سکتی ہے —— میں دل ہی دل میں انھیں جلی کٹی سنا رہا تھا۔ اور اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

میں جب بہت آگے چلا آیا، اور سڑک کے اس نکڑ پر پہنچا، جہاں اور بھی بسیں کھڑی تھیں۔ تو میں ٹھٹک گیا، وہاں بسیں ویران سی تھیں، وہاں کوئی ہجوم نہ تھا۔ ایک بس کے سامنے چند آدمی کھڑے تھے۔ میں ان کے قریب آیا۔ ان میں وہ ڈرائیور بھی کھڑا تھا۔ جو ہماری بس ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی پگڑی ڈھیلی ہو گئی تھی، اس کے چہرے پر تانبے کا رنگ تھا، وہ بیزاری اور اکتاہٹ میں بیڑی کے کش لے رہا تھا۔

"آپ نے شاید نہیں سنا؟" میں نے کہا۔

"کیا؟"

"رستہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ وہاں پر لوگ بسوں میں سامان لاد رہے ہیں۔"

"وہ پاگل ہو گئے ہیں سالے" ڈرائیور نے بیزاری اور غصے میں کہا،

اور میرا دل ڈوبنے لگا۔

"مجھے ابھی ابھی ٹریفک انسپکٹر ملا۔ ابھی راستہ ٹھیک نہیں ہوا ہے"

"سچ"

"اور کیا، میں جھوٹ تھوڑا بولتا ہوں، میرا دل بے چین ہے۔ مجھے آج ہی واپس گھر پہنچنا تھا صاحب"

مجھکو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ مزید کہنے لگا۔

"چند دنوں میں میرے لڑکے کی شادی ہے، ملٹری میں کام کرتا ہے وہ، مجھے آج ہی سرینگر سے جموں واپس آنا تھا، بہت سے کام کرانے ہوتے ہیں، شادی کا معاملہ ہے۔ اور گھر میں کوئی اور بڑا آدمی نہیں، وہ لوگ کہتے ہوں گے یہ اوم پرکاش کہاں مر گیا عجیب مصیبت ہے —— لڑکے کی شادی نہ ہوتی تو ہم بھی یہیں پڑے رہتے، گھر میں کرنا بھی کیا تھا، لیکن —— لیکن صاحب بڑی پریشانی ہے"

اس نے بیڑی کا زور سے کش لیا، اور پھر متواتر کش لیتا رہا میں اس کی پیلی پیلی آنکھوں میں پھیلتی ہوئی پرچھائیوں میں الجھتا رہا —— یہ تلخی یہ بیچارگی، یہ بے بسی —— یہ پھیلتی ہوئی پرچھائیاں۔

مجھے اوم پرکاش کی بے چارگی اور تلخی کا شدید احساس ہوا۔ مجھ سے اس کے چہرے کی حالت دیکھی نہ گئی، میری روح میں تلخی

اتر گئی، اور میں بے چینی میں آگے بڑھنے لگا، چند قدم چل کر فوراً مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہوا۔ میری سوچ حیران تھی، میں حیران تھا کہ کیا کروں، دراصل ابھی راستہ ٹھیک نہیں ہوا ہے خواہ مخواہ کسی نے وہاں بے پر کی اڑائی ہے۔ میں آگے چلتا رہا، لوگ دکانوں پر بیٹھے تھے، انتظار کی تھکن چہروں پر لئے ہوئے، اور جب میں گوردوارے کے قریب پہونچا، دل نے کہا، جاؤ، اوپر کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے آرام کرو، کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ لیکن دماغ نے دل کی بات روکی ——— اگر اس طرف راستے کے کھلنے کی اطلاع آئی، تو ——— تو اس وقت کوئی بھول کر بھی کسی کو نہیں پوچھے گا ——— نفسا نفسی کا عالم ہوگا، آجکل کی مصروفیت اور برق رفتار زندگی میں انسان کو خود اپنی ذات کی خبر نہیں رہتی، وہ دوسروں کی خبر کیا لے،

میں چند لمحات تک وہیں کھڑا رہا

میں وہاں بے مقصد کھڑا تھا، اور پھر میں دائیں بائیں دیکھتا رہا۔ لیکن اس وقت گرد و پیش کی چیزیں مجھے خلط ملط نظر آرہی تھیں، کچھ دھندلے سے خاکے بے ترتیب نقوش، مبہم لکیریں۔ میں کہاں تک دیکھ رہا تھا، اور کیوں دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں کس کی متلاشی تھیں، ؟ میری ہر نظر بکھر کیوں جاتی تھی ؟ میرا دل کیوں بیٹھا جا رہا تھا، یہ کائنات ایک بوجھ بن کر میرے وجود پر کیوں

چھارہی تھی؟ ـــــ

بے چینی کی اس حالت کا کیا نام ہے؟ ـــــ اگر آج راستہ ٹھیک نہ ہوا تو ـــــ؟

گھر پر سب ہی تو پریشان ہوں گے، میرے بھائی بہن، امّی اور والد صاحب ـــــ وہ کل شام کو ہی میری آمد کے متوقع تھے، لیکن کل ـــــ؟ اور آج ـــــ؟ اگر آج بھی نہ پہنچ سکا تو ان کی تشویش اور پریشانی کتنی بڑھ جائے گی، ان کا رہا سہا سکون لٹ جائے گا۔ میں مدت کے بعد آرہا ہوں اور اس دوران وہ سب میری جدائی میں تڑپتے رہے اور میرے دل میں بھی ان کے لئے محبت اور شفقت کا سمندر امنڈ رہا تھا، اور میں اپنے جذبات کے ہیجان کو کیا کروں؟

اس ہیجان سے کون آگاہ تھا؟ بظاہر میں خاموش تھا، مطمئن اور پر سکون، لیکن دل کی گہرائیوں میں کتنے طوفانوں کو چھپائے ہوئے تھا، یہ کوئی نہ جانتا تھا، سمندر کی پر سکون سطح کے نیچے پلتے ہوئے طوفانوں کو کس نے دیکھا ہے؟

میں برسوں کی روح فرسا ذہنی کشمکش سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ یہ ذہنی کشمکش انسان کی قوتوں کو شل کرتی ہے۔ میری تقدیر کا شیرازہ ابھی تک بکھرا ہوا تھا، اور میں اس کی شیرازہ بندی کرنے کے لئے گھر جا رہا تھا، مجھے زندگی کے خوابوں کی

تعبیر کی تلاش تھی، میں مستقبل کی محرابوں پر آرزو کے چراغ روشن کر رہا تھا، آج میرا خون جگر اتنا ارزاں تھا، کہ ان چراغوں کی لو میں تیز کر سکوں، میں خارزار دل سے گذر کے آیا تھا،... چھالے پھوٹ کر بہہ نکلے تھے، اور سامنے ڈوبتی ہوئی رات کے راستے پر دور دل سے صبح آرزو کی منزل ابھر رہی تھی، مسکرا رہی تھی، اسی منزل کے شبنمی اجالوں میں میری رشی اپنی مرمریں باہیں کھولے میرا انتظار کر رہی تھی، اس کی ریشمی پلکوں پر وفا کے ستارے لرزاں تھے، یہ ستارے کب سے فروزاں تھے، اور میں نے قدم قدم پر ان ستاروں سے روشنی لی ہے۔ میرے تاریک راستے جگمگا اٹھے ہیں۔ بی، اے پاس کر لینے کے بعد جب رشی کے والدین نے کہلوا بھیجا کہ وہ ایک ایسے انسان سے رشیدہ کی شادی کریں گے، جو ایم، اے پاس ہو آخر ان کی لڑکی گریجویٹ ہے۔ تو میں لمحہ بھر کے لئے سکتے میں آگیا، در اصل یہ انکار کی ایک صورت تھی، وہ جانتے ہیں کہ میں مزید تعلیم حاصل کرنے سے قاصر ہوں اس لئے کہ میرے پاس پیسے نہیں، میں اتنا روپیہ کہاں سے لاؤں کہ باہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکوں اور جب رشیدہ نے مجھے لکھا کہ اس کے گھر والے اب اس رشتے کے حق میں ہیں، لیکن وہ چاہتے ہیں کہ آپ ضرور ایم۔ اے پاس کر کے آجائیں، دو سال کا عرصہ ہوتا ہی کتنا ہے۔ میں آپ کی

یاد کو دل میں لئے آپ کی منتظر رہوں گی، اور پھر ہم مل کر نئی زندگی کی تعمیر کریں گے ـــ کتنا حسین پیغام تھا، کتنا حیات بخش جان افزا، وفا آگیں! میرے دل میں ایک نئے ولولے اور جذبے نے انگڑائی لی، میں نے ایم۔ اے کرنے کی ٹھانی، ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے، تھوڑی سی رقم وصول کی، اور لکھنؤ چلا گیا جہاں میرا اماموں زاد بھائی بزنس کرتا تھا۔ اس نے مجھے مزید تعلیم کے لئے اس سے پہلے بھی لکھنؤ آنے کو کہا تھا، وہاں پہونچ کر وہ میرے لئے ایک بڑا سہارا بن گیا۔ دو سال وہاں رہ کر میں نے بڑی محنت سے کام لیا۔ دن رات محنت کی۔ میری صحت بہت گر گئی، لیکن میں برابر کام کرتا رہا۔ اور دو سال کے بعد میں نے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ڈگری ملتے ہی مجھے وہیں ایک ایوننگ کالج میں عارضی ملازمت مل گئی، میں نے گھر والوں کو خط لکھا۔ اور رشیدہ کو اطلاع دی کہ میں چھ مہینے کے بعد آؤں گا رشید کا خط آیا، اس کی مسرتوں کا آئینہ دار، اس کی محبتوں اور خوابوں کا عکس جمیل ـــ انتظار کی پرسوز دھڑکنوں کا امین "رشیدہ میری ہے، صرف میری ـــ" یاد لگا ہوں

میں بھرتی ہے تو یونانی دیو مالاؤں کی کوئی حسین و جمیل شہزادی سامنے آ گئی ہے، وہ دو سال تک میرے ساتھ کالج میں پڑھی تھی، وہ بھی آرٹس پڑھتی تھی۔ ان دنوں کالج میں لڑکیوں کا ایک ہجوم تھا

لیکن سبھوں میں مجھے اس خاموش سی دلنشیں خد و خال والی تیلی سی لڑکی کی تصویر لگا ہوں میں چھائی رہتی —— وہ چھوٹا سا معصوم چہرہ، دوشیزگی کا تقدس اور نرمی لئے ہوئے، لمبی لمبی بادامی آنکھوں کی گہری ذہانت، پلکوں کی کانپتی چلمن، پتلے پتلے خمدار ہونٹ —— اس کے لباس میں ہمیشہ ایک سادگی تھی، سوتی کپڑے کی قمیض اور شلوار، معمولی سا دوپٹہ، اس سادگی میں جو حسن اور تمکنت تھی، وہ میرا صبر و سکون لوٹ لیتی!

اس کی تصویر میری روح میں نقش ہو کر رہ گئی

لیکن پہلے سال اکھٹے تعلیم پا کر بھی مجھے اس سے بات کرنے کی جرأت پیدا نہ ہوئی تھی، اسے قریب دیکھ کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا، اور میرے بدن پر پسینے چھوٹ جاتے، میرے لب گنگ ہو کر رہ جاتے!

اور وہ —— ؟ اس کے معصوم رخسار دل میں چنگاریاں بھڑکا اٹھتی، اس نے کئی بار لائبریری اور کلاس میں مجھ سے بات کی، ہسٹری کے نوٹس مانگے۔ کمپوزیشن کی نئی کتاب مانگی، اور میں خاموشی سے وہ چیزیں دیتا رہا۔ لیکن جب اس سے دور ہو جاتا، کلاس میں بیٹھتا، یا گھر روانہ ہوتا، تو اپنے آپ کو کوستا —— تم سچ مچ گونگے ہو!

تم بزدل ہو ——!

لیکن ایک دن میں اپنی بزدلی پر غالب آگیا۔

صبح ہی سے زوروں کی بارش ہو رہی تھی، شاید رات بھر مینہ برسا تھا۔ فضائیں بھیگ چکی تھیں، ہوا بہت ٹھنڈی تھی، صبح کے دس بج رہے تھے، میں اس رومانی فضا میں کالج جانے کے موڈ میں نہ تھا۔ بھیگی بھیگی فضاؤں میں جب، بارش کے مسلسل قطرے بنگلے کی چھت سے ٹکرا ٹکرا کر ایک خواب آور موسیقی کی تخلیق کرتے ہیں۔ تو لبستر میں گھس کر خوابوں کی حسین اور جھلملاتی پرچھائیوں میں ڈوب جانے میں کتنا مزہ آتا ہے ——— میں نے کالج جانے کا ارادہ ترک کیا، ہارڈی کا ناول "ٹیس" ہاتھ میں اٹھایا، لیکن ———"

لیکن رشیدہ کالج گئی ہو گی۔ اور آج دن بھر میں اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پاؤں گا، یہ دن کتنا بے کیف رہے گا۔ بے کیف، ویران اذیت ناک! اور پھر اتنی طویل رات ———!

دوسرے لمحے میں کالج جانے کے لئے تیار تھا۔

میں نے چھاتا ہاتھ میں اٹھایا، بند گلے پٹو کا کوٹ پہن لیا، اور تانگے پر سوار کالج پہنچا۔

بارش اب بھی ہو رہی تھی۔

کالج کے راستے میں پانی سے باڑھ آگئی تھی، فضاؤں میں بادلوں کے گہرے سائے تھے، درخت خاموش تھے، بھیگے بھیگے، اداس کالج پر آج سناٹا چھایا تھا، اور لڑکے خلاف معمول کلاسوں میں دبکے پڑے

تھے۔

چھٹے پیریڈ کے بعد ہم پرشین کلاس گئے، معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب چھٹی پر ہیں، میں کھڑکی کے قریب کھڑا تھا' جانے کے لئے میرے پاؤں نہیں اٹھ رہے تھے' کیونکہ رشیدہ ابھی تک وہاں نہ آئی تھی' شاید وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ پہلے ہی گھر گئی ہے' میرا دل ڈوبنے لگا' فارسی کے طلبار منتشر ہو چکے تھے' اور میں وہاں کھڑا تھا —— تنہا تنہا' اداس' بے قرار!!

باہر اچانک بارش نے شدت اختیار کی تھی۔

کہاں ہو تم میری قرار جان —— ؟ میری روح کی پکار گم ہو گئی۔ لمحے گہرائی ہو گئے۔

ماحول کا رومانی حسن کافور ہونے لگا۔ دور و نزدیک جیسے ماتم کی دلدوز صدائیں آرہی تھیں۔

اچانک اس ویرانی اور خاموشی میں رشیدہ کی صورت ابھر آئی، میری آنکھوں میں جیسے بجلی کوند گئی' وہ کلاس میں مجھے تنہا دیکھ کر ٹھٹکی جھجکی اور شرمائی' اس کی قمیص اور دوپٹہ بھیگے بھیگے تھے' اور بالوں کا ایک الجھا ہوا گچھا دودھیا رنگ کے ماتھے پر چپک گیا تھا۔

میں اس کو دیکھتا ہی رہا' جیسے میں خوابوں کی شہزادی کو دیکھ رہا تھا۔ خوابوں کی دور افتادہ بستی میں۔

"آج کلاس نہیں لگے گی ؟" اس کی آواز کانپی۔

"جی ــــ جی نہیں، پروفیسر صاحب نہیں آئیں" میرا گلا سوکھ گیا۔

"پھر تو چلنا چاہیئے ــــ کتنی سردی ہے، اور یہ موئی بارش ــ" یہ کہہ کر وہ پلٹی

لیکن اس بارش میں وہ کہاں جائے گی، تانگہ تو کالج کے احاطے سے باہر دور سڑک کے اختتام پر ہی مل سکتا ہے۔ اور غالباً اس بارش میں تانگہ ملنا بھی آسان نہیں، میری تشویش بڑھ گئی۔ اور میں کانپتے ہوئے ہاتھ کے ساتھ چھاتا لے کر اس کے پیچھے چلا۔

"سنیئے ــــ" میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

"جی ــــ" وہ مڑ گئی، اس کے رخسار تمتمائے، شعلہ بار ہوئے

"آپ اتنی بارش میں ــــ" زبان میرے دل کا ساتھ نہ دے سکی۔

"لیکن چارہ بھی کیا ہے، گھر تو پہنچنا ہی ہے ــــ" وہ روانی سے گفتگو کر رہی تھی۔ اس کے پتلے سے خمدار ہونٹوں پر تبسم کی ایک کرن پھیل گئی۔

"آپ میرا چھاتا لیجیے، میں ــــ"

"لیکن آپ کیا کریں گے، آپ کو بھی تو ــــ"

"میں کچھ دیر ٹھہروں گا، نہیں تو تانگے سے جاؤں گا ــــ"

وہ رکی، کسی سوچ میں پڑ گئی اور بولی۔

اس کی گہری نگاہیں میری الجھی ہوئی نگاہوں سے ٹکرائیں۔

اف وہ لمحہ ———!

وہ برق پاش لمحے!

اس کی دراز ریشمی پلکوں کی تھرتھراہٹ!

اس کے کنوارے رخساروں کی آگ —!

اور میرے دل کی محشر خیزیاں ———!!

وہ چھا جانے چکی تھی،

اس کے قدموں کی مترنم چاپ بارش کے شور میں گم ہو چکی تھی، لیکن میری دھڑکنوں کا انتشار باقی تھا۔

یہ انتشار اب بھی ہے، اور ہمیشہ باقی رہے گا!

"رفیق صاحب ———!"

یہ پنڈت جی تھے

میں نے ان کی طرف نظر اٹھائی، بادل نخواستہ، میں کھڑا نہ ہو سکا

کب سے میں سڑک کے کنارے اس سیاہ چٹان پر بیٹھا یادوں کی حسین پرچھائیوں میں ڈوب چکا تھا۔

دور پہاڑوں کے نشیب و فراز میں پرچھائیاں ہلکورے لے رہی تھیں، خوابوں کی دھند انگڑائیاں لے رہی تھی!

پانچ بج چکے تھے۔

شام ہو رہی تھی،

"لیجئے مبارک ہو، ابھی ابھی خبر آئی ہے، پی۔ ڈبلیو، ڈی والوں نے بتایا راستہ ٹھیک ہوگیا ہے۔ لیکن کانوائے صبح کو ہی چلے گی۔ آئندہ تو یہ مصیبت نہ رہے گی، پہاڑوں کو چیر کر سرنگیں نکالی جائیں گی ——— حکومت جرمنی سے انجنیروں کو بلا رہی ہے۔"

آئندہ کی بات کون جانے، فی الحال شکر کا مقام ہے کہ ہم کل روانہ ہوجائیں گے میں نے اطمینان کی سانس لی۔

"لیکن آج کی رات بھی مصیبت کی رات ہے، بھگوان کی اِشا کو کون ٹال سکتا ہے۔

پنڈت جی یہ کہہ کر آگے بڑھے۔

یہ خیال مجھے کچوکے لگاتا رہا کہ آج کی رات بھی یہیں گذارنا ہے۔ یخ بستہ طویل رات ——— ویران ویران سی رات!!

کاش میں یہاں سے ابھی ابھی بھاگ سکتا، پر لگا کر اڑ سکتا، اور چپکے سے اپنے گھر پہونچ جاتا، آہستہ سے آنگن کا دروازہ کھولتا، دبے پاؤں اندر آتا۔ اور دہلیز کو پار کر کے رسوئی کے دروازے پر رکتا، اور اسلام علیکم کا نعرہ لگاتا، جونہی میری امی اور چھوٹے بہن بھائی مجھے دیکھتے تو ———!

میری غیر متوقع آمد ان سبھوں کو حیرت میں ڈال دیتی!

اور پھر میں سفر کی ساری دلچسپ باتیں ان کو سناتا۔ ہنسی مذاق

اور متفق ہوتے اور پھر میں چاچی سے رشیدہ کا حال پوچھتا۔ کتنی اچھی ہے میری چاچی ـــــ میری راز دار، غمگسار، میری ہمدرد!

"رشی نے پچھلے تین مہینوں سے ایک خط بھی نہیں لکھا" میں زبردست شکایت کرتا، احتجاج کرتا، روٹھ جاتا، اور پھر چاچی اپنے مہربان لہجے میں سب حالات بتاتی، رشی کے بدلے صفائی پیش کرتی، اور

"آداب عرض ـــــ" رنجیت سامنے تھا، اور اس کے ہمراہ ٹریننگ یافتہ تین چار نوجوان بھی۔

"ست سری اکال ـــــ" میں نے نعرہ لگایا۔

وہ سب ہنسے۔

"کہو رنجیت کیسے ہو؟ کل سے نظر ہی نہیں آئے"

"بس بیٹھے رہے، آج دوپہر کو پیدا گئے تھے وہاں تک، جہاں سڑک خراب ہوئی ہے۔

"اچھا" تو کیا حال ہے اب سڑک کا؟"

"اب تو ٹھیک ہو گئی ہے، لیکن ـــــ"

"لیکن کیا؟

"انجنیئر کہہ رہا تھا کہ یہ سڑک عارضی، دوپہر چالو رہے گی ـــــ"

"ہماری گاڑی تو اسے گذر جائے ـــــ" ایک لڑکا بیچ میں بولا۔

"پھر جہنم میں جائے یہ سڑک، اور یہ پہاڑ ـــــ دوسرے نے جملہ پورا کیا۔

"یہاں تو سالی سردی جان لے کر رہے گی ——" ایک اور تلخی سے بڑبڑایا۔

"میں نے صبح ہی کہا تھا تم سے احمد پیدل چلیں گے۔ تم نہ مانے بدھو ——"

"مجھے کیا معلوم تھا، آج بھی رکنا پڑے گا ——"

"تو کیا تم یہاں سے پیدل جانے کی سوچ رہے تھے ——" میں حیرت زدہ تھا،

"اور کیا جناب، بانہال بازار تک پیدل جاتے، اور پھر وہاں سے کوئی لبس یا چھکڑا پکڑ لیتے ——"

"لیکن یہ پہاڑی راستے، یہ برف، اور بارش —— اور کم سے کم ساٹھ ستر میل کا فاصلہ ——"

"فاصلے کو کون دیکھتا ہے۔" وہی لڑکا بولا۔

"میں نے ہی ان کو روکا رفیق صاحب ——" رنجیت بولا" ورنہ یہ تو ضرور چلے جاتے ——"

"بھئی تم کون ہو روکنے والے۔ اگر کل راستے میں پھر گڑبڑ ہوئی، تو میں پہلا نوجوان ہوں جو پیدل جائے گا ——"

"پھر تو میں بھی ساتھ آؤں گا"

"اور کیا یہاں بھوکوں مرنا ہے۔"

"پاگل ——!" میں نے دل میں سوچا، مجھے اس احمقانہ گفتگو

سے کوفت سی ہونے لگی۔ میں آگے بڑھا، اور سیدھے دین محمد کی دکان کی طرف گیا۔

دین محمد کی دوکان اس وقت بحث کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی، دوکان مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، لوگ جسموں کو سکیڑ کر پرانی اور میلی سی بنچوں پر ٹانگیں سمیٹے بیٹھے تھے، کچھ لوگ پیٹ سے دہکتی ہوئی کانگڑی چمٹائے بیٹھے تھے، میں بھی ایک گوشے میں بیٹھ گیا دکان کے عقبی حصے میں اندھیرا تھا، اس نیم تاریکی میں بھی کچھ لوگ بیٹھے تھے، کچھ لوگ چائے پی رہے تھے، اور کچھ گرما گرم روٹیاں کھا رہے تھے، باقی لوگ بحث میں الجھے ہوئے تھے، ان میں خواجہ صاحب پیش پیش تھے، چہرے پر بیزاری اور بدولی کی [illegible] لے کر حقے کی نے منہ میں دابے ہوئے انہوں نے اپنے لئے ایک مخصوص جگہ پسند کی تھی، جب میں نے دیکھا، وہ اپنی جگہ بیٹھے نظر آئے۔ خواجہ صاحب کے ساتھ ہی انور صاحب بیٹھے تھے، وہ بھی بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے تھے،

انور صاحب نے دکان میں داخل ہو کر مجھے پھر مخاطب کیا تھا،

"رفیق صاحب، آپ تو پھر نظر ہی نہ آئے، میرا خیال تھا آپ ملتی

میں آئیں گے، اور پھر وہاں ایک چھوٹا موٹا مشاعرہ ہوگا۔

"معاف کیجئے۔ میں شاعر نہیں ہوں ــــــ"

"تو کیا ہوا، آپ صدارت کی کرسی سنبھالتے ــــــ"

"شکریہ، دراصل مجھے اس طرف دھیان ہی نہ رہا۔ یہیں بازار میں گشت لگاتا رہا۔"

"یوں کہئے آپ سڑک گشتی کر رہے تھے"

میں نے کوئی جواب نہ دیا، اتنے میں تاریک کونے میں ایک آدمی کا ایک بھیانک، عریاں سا قہقہہ بلند ہوا۔

قہقہہ ڈوب گیا۔

سب لوگ لمحہ بھر کے لئے کونے میں بیٹھے ہوئے قلندر کی طرف دیکھنے لگے، لمبے لمبے خشک بالوں والا آدمی، سیاہ آنکھیں بے چین، حیران، وحشت ساماں، لمبوترے چہرے پر ہفتوں کی داڑھی بڑھی ہوئی، الجھی ہوئی داڑھی موٹے سیاہ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی اور ننگے سیاہ فام بدن پر پرانے ٹیوٹ کا ایک ڈھیلا ڈھالا فرن، اور فرن کے اندر سینے کے ساتھ ایک آگ سے بھری ہوئی لوٹی پھوٹی کانگڑی۔

قہقہہ لگانے کے بعد وہ دکان کی کالی چھت کو وحشت خیز آنکھوں سے گھورنے لگا، لوگ پھر اپنی باتوں میں لگ گئے، میں چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا ــــــ اندھیرے کا دیوتا، اور اس کا ویران

سا قہقہہ، پاگلوں کا سا ـــــــ کوئی پاگل ہوگا بے چارہ، میں نے دیکھا کہ کسی نے بھی اس کے بارے میں بات نہ کی۔ اور نہ اس کے بے وقت کے بھیانک قہقہے پر کوئی تبصرہ کیا، میں نے بھی جلد ہی اسے نظر انداز کیا،

انور صاحب کے مقابل میں مضبوط جسم والا ڈرائی کلینر تھا، اسمال جو یہ بھی کل سے غائب رہنے کے بعد مجھے اس وقت نظر آیا تھا، اور مجھے دیکھ کر ہی اس نے پھیکی سی بے جان مسکراہٹ کے ساتھ مجھے خیر مقدم کیا تھا، اسمال جو کے قریب ہی وہ جوشیلا انسان تھا، جس کے بارے میں مجھے ابھی صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ زور زور سے باتیں کرتا تھا، جوش و خروش کے ساتھ، ایک سیماب پا نوجوان۔ جو ہر وقت اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کرتا ہے، میں نے اسے گہری نظر سے دیکھا، یوں تو قد و قامت اور جسمانی ساخت اور جسامت کے لحاظ سے وہ کم عمر نظر آتا تھا، لیکن اس کے چہرے کو بغور دیکھنے سے، چہرے کی جلد میں پھیلی ہوئی باریک گرہوں کو کھوجنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لگ بھگ چالیس برس کا ہوگا ـــــــ بیضوی چہرہ، پتلا سا، موٹے موٹے ہونٹ، گھنی بھویں، بے چین سی چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں، کلین شیو چہرہ، وہ ایک پرانے سے لاجوردی رنگ کے گشمیرے کے سوٹ میں ملبوس تھا، قمیض کا بٹن کھلا ہوا، سر پر سیاہ چمڑے کی گول ٹوپی

شاید کاروباری آدمی ہے، اور بزنس کے سلسلے میں سرینگر کے باہر گیا ہوا ہوگا، میں سوچنے لگا۔

"اللہ کے راستے میں ہر قدم پہ آزمائش سے گذرنا پڑتا ہے
میں چونک اٹھا۔ دوکان کے دائیں طرف ایک آدمی بولا، اس کا لہجہ پر تکلف تھا، اس کا نصف چہرہ تاریکی میں تھا، اور نصف دن کی ہٹتی ہوئی روشنی میں [illegible] یہ ملاؤں جیسی آواز اور لب ولہجہ سن کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس ذات شریف کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا، ہو سکتا ہے یہ بھی ہمارا ہمسفر ہو، اور کسی دوسری بس میں سفر کر رہا ہو۔ میں نے دیکھا اس کے گورے کتابی چہرے پر ترشی ہوئی گھنی داڑھی تھی، مہندی کے رنگ میں رنگی ہوئی اور سر پر عمامہ!

"حاجی صاحب، آپ تو اجمیر شریف سے ہو آئے ہیں، شاید پہلی بار ان راستوں سے گذر ہوا ہے۔ لیکن ہم گنہگار روز یہاں سے گذرتے ہیں ــــ"

چولھے کے نزدیک ایک سٹول پر بیٹھے ہوئے ملٹری وردی میں آدمی نے کہا۔

"بندہ پرور" ہم نے ساری زندگی سفر میں کاٹی ہے۔ ہر قدم پہ آزمائش سے گذرے ہیں۔ جس زمانے میں ہم بیت اللہ بھی گئے، اتنی مشکلوں کا زمانہ تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا،

ہر حال آزمائش مردِ مومن کے لئے مخصوص ہے۔ آزمائش کڑی ہوتی ہے۔ لیکن، عارضی ـــــ صبر سے کام لیجیے۔ اِنَّ اللّٰہ مع الصابرین ـــــ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں اللہ تبارک تعالےٰ کا فرمان ہے ـــــ"

"یہ ٹھیک ہے حاجی صاحب، ـــــ جوشیلے نوجوان سے چپ نہ رہا گیا۔

"لیکن صبر سے کب تک کام لیا جائے، یہ لوگ، بڑے کام چور ہیں، بے ایمان ہیں، گورنمنٹ کا پیسہ کھاتے ہیں، لیکن، کام نہیں کرتے زیادہ سے زیادہ گھنٹے بھر میں مرمت ہو سکتی ہے۔ لیکن ان سالوں نے دو دن لئے حرام کھاتے ہیں یہ لوگ، اور دوسروں کی پرواہ نہیں کرتے ـــــ"

"یہ بات... کہی آپ نے سچ ـــــ" سامنے بیٹھا ہوا ڈرائیور حیدر ملک بولا۔ حیدر ملک سے میں کل رات کو اسی دکان پر ملا تھا، ایک پرائیوٹ گاڑی چلاتا ہے۔ اور ہر بات میں ضرور گالی دیتا ہے "الو کے پٹھے، حرامی، سور کے تخم ـــــ صرف حرام کھاتے ہیں، ـــــ"

"یہ لوگ بڑے بڑے ٹھیکے لیتے ہیں" اذر صاحب بھی بحث میں برابر کے حصہ دار تھے،

"ہزاروں لاکھوں سمیٹتے ہیں، لیکن کام وام کچھ نہیں۔ ـــــ"

"کام کرنے سے ان کی جان نکلتی ہے۔

"حرام کھانے والوں کے لئے اللہ تعالی جل جلالہ، نے جہنم کی آگ تیار رکھی ہے۔ اور صرف ایک جہنم نہیں، بلکہ سات جہنم کی آگ تیار رکھی ہے"۔ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں، اللہ تعالی کا فرمان ہے ــــــ"

"بالکل درست فرمایا آپ نے حاجی صاحب ــــــ"

اچانک دین محمد کی آواز آئی، گرجتی ہوئی آواز، جیسے کوئی پہاڑی نالہ گرج رہا ہو۔

سب متوجہ ہوئے۔

"میں نے کہا یہ لوگ آج تمہیں جہنم میں سینکتے ہیں، جلا کر اکھ کرتے ہیں، تمہاری بوٹی بوٹی کو راکھ بناتے ہیں، اور کل ــــ ان کو دوزخ میں جانا ہوگا ــــ کل ــــ ہا ہا ہا ــــ"

دین محمد کی آواز اور قہقہے میں گہرا طنز تھا۔

سب خاموش ہو گئے۔

دین محمد پھر چپاتی بنانے میں لگ گیا۔

خلیل میاں، خواجہ صاحب کے کہنے پر باہر حقے میں تازہ پانی ڈال رہے تھے، آج دکان میں ایک اور آدمی بھی کام کر رہا تھا، شکل وصورت اور لباس سے وہ ایک غریب دیہاتی معلوم ہو رہا تھا۔

"تمہاری کھوپڑی میں بھس بھرا ہے، خلیل بڈھے ــــ"

دین محمد غصے میں آگیا،

"کیوں جی کیا ہوا؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"یہ حقّے کا باسی پانی ذرا سڑک کے پار پھینک دیتے، اس کی ساری بدبو دکان میں گھس گئی ــــــ"

"بڑا بدتمیز ہے یہ آدمی، حسنِ تمیز صرف ایمانداروں کے حصے میں آیا ہے، یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں، اللہ تعالیٰ ــــــ"

"رہنے دیجیے حاجی صاحب ــــــ میں نے ہی کہا تھا بیچارے کو ــــــ"

خواجہ صاحب بگڑے۔

میں اس جھک جھک سے بے نیاز، اب بھی دین محمد کی بات پر غور کر رہا تھا، یہ آدمی کتنا عجیب ہے، ایک چٹان کی طرح سخت مضبوط، غیر متزلزل، سنگلاخ چٹانوں کا پروردہ، جس کو ہر وقت اپنے کام سے کام ہے۔ اور دنیا کی کسی اور فکر یا غم سے جس کو دور کا بھی واسطہ نہیں، جو دنیا والوں کے دکھ درد کا تمسخر اڑاتا ہے، جس کی باتوں میں زہر کی تلخی ہوتی ہے۔ جو لاگ لپیٹ کا قائل نہیں، کھری کھری سناتا ہے۔ جس کے سینے میں دل نہیں، پتھر کی سل ہے، جو کل سے مسافروں کی جیبوں پر خوب ہاتھ صاف کر رہا ہے، ایک آنے کی چپاتی تین آنے میں، اور سبزی پلیٹ کو آٹھ آنے میں بیچتا ہے

مجھے دین محمد سے نفرت بھی تھی، لیکن اس میں دلچسپی بھی بڑھ رہی تھی۔ —— یہ سنگدل آدمی، جو شاید ہمیشہ سے ایسا ہی چلا آرہا ہے اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ اردگرد فلک بوس پہاڑوں کی طرح —— مضبوط، سخت غیر متزلزل

صبح جب میری آنکھ کھلی، تو میں حیران رہ گیا، میری خمار آلود آنکھیں چکاچوند ہو گئیں، سارا کمرہ سفید جگمگاتی ہوئی ٹھنڈی روشنی سے بھر گیا تھا، میں نے آنکھیں بھیچ لیں، اور غور سے دیکھنے لگا، لکڑی کی دیواروں کی درزوں اور سوراخوں اور کھڑکی کے شیشوں سے روشنی کا سمندر اندر لپک رہا تھا۔

یہ روشنی ــــــ

یہ ٹھنڈک ــــــ

کہیں برف تو نہیں گری ہے ــــــ!

یہ خیال بجلی کی رَو کی طرح میرے خوابیدہ خیالوں کو چھو گیا، میری رگوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی، آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا لمحہ بھر کے لئے میں بے حس و حرکت لیٹا رہا۔

اور پھر میں نے کمرے کے دروازہ کے قریب سردار بچوں کی باتیں سنیں، وہ چڑیوں کی طرح چہک رہے تھے، اور نئی برف کی باتیں کر رہے تھے،

برف!

یا اللہ افوہ!

سچ مچ برف گری ہے، اب کیا ہوگا؟

اب کیا ہوگا؟

مایوسی کا زہر میری رگ رگ میں اترنے لگا۔

ایک تیز جھرجھری میرے سکڑے ہوئے جسم پر دوڑ گئی۔

میں لب... سے اٹھا، اور کھڑکی کے قریب آیا۔

اتنی ساری برف ماشا اللہ ہر طرف برف کے پہاڑ ہی پہاڑ نظر آرہے تھے۔ صنوبر اور چیل کے درختوں پر برف کی موٹی موٹی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ اور پتوں پر برف کے پھول کھل چکے تھے گڈھے اور کھائیاں برف سے بھر چکی تھیں، دور پہاڑوں کے دامن میں پھیلی ہوئی وادیاں برف کا نقرئی لبادہ اوڑھے ہوئے تھیں، ان وادیوں میں بدرحواہ بھی ہے۔ ایک مشہور وادی، چشموں اور آبشاروں کی نغمہ آفریں وادی، جو جموں میں کشمیر کہلاتی ہے۔ جہاں پھلوں اور پھولوں کی بہتات ہے، جہاں بہار کے دنوں میں رعنائیاں جادو جگاتی ہیں، اور ان رعنائیوں میں جو لوگ سانس لیتے ہیں، وہ صورت سے بھی اور سیرت سے بھی خوبصورت ہیں۔ خوبصورتی اور حسن کے پرستار، رقص و موسیقی اور شاعری کے دلدادہ، جہاں بہار کے ایام میں رنگارنگ پھول کھلتے ہیں۔ آج وہاں برف کے پھول کھلے تھے —— برفستان کی خاموش

بے حس اور اجاڑ وادی!

اور سامنے سڑک کے اس طرف نشیبی سطح پر چند سرکاری کوارٹر برف میں غائب ہو چکے تھے، اور سڑک پر کئی فٹ برف جمع ہو چکی تھی۔

اتنی ساری برف!

اتنی برف میں نے سرینگر میں کبھی نہ دیکھی تھی، صرف اپنے مرحوم دادا جان کی زبانی سن چکا تھا کہ اگلے وقتوں میں مکانوں کی دوسری اور تیسری منزلوں تک برف گرتی تھی، مکانات دب جاتے تھے، ٹریفک مہینوں تک بند رہتا ——"

اچانک جنگلی کوؤں کی ایک آوارہ جماعت سامنے سے گذر گئی، کائیں کائیں کرتی ہوئی —— مرگ آلود اور یخ لبستہ سناٹے میں ایک تھرتھری سی دوڑ گئی!

پھر خاموشی گہری ہو گئی۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ فضائیں زندگی کی حرارت سے محروم ہو چکی ہیں، وہ مر چکی ہیں، اور اب کفن اوڑھے ہوئے ہیں، ابھی ابھی کوؤں کی صدا، صدائے ماتم بن کر بکھر گئی تھی —— میں گھبرا گیا۔

چاروں طرف خاموشی تھی،
موت کی سی خاموشی ——!

سڑک پر دور دور تک کسی آدم زاد کا نشان تک نظر نہیں آرہا تھا، کوؤں کی جماعت کہیں دور برفیلی خلاؤں میں ڈوب چکی تھی۔

سناٹا مکمل ہو چکا تھا۔

اور برف کے موٹے موٹے گالے موت کے فرشتوں کی طرح پر پھڑپھڑاتے ہوئے اتر رہے تھے ـــــ!

میں کھڑکی سے واپس مڑا، تو میں نے دیکھا کہ سامنے کی دیوار کے ساتھ سردار جی اور لکھنؤ کے پریم کمار دو چھوٹی سی منجیوں پر بے خبر سوئے پڑے ہیں، کل جب میں شام کو دین محمد کی دکان سے لوٹا تھا تو ان دونوں حضرات کو یہاں براجمان دیکھا، پریم کمار نے چہرہ لحاف سے ڈھانپ لیا تھا۔ وہ لحاف میں اس قدر سمٹے ہوئے تھے کہ ان پر ایک چھوٹے بچے کا گمان ہوتا تھا، سردار جی کا وسیع چہرہ نیند کی ملائمیت لئے ہوئے تھا، شاید وہ اس وقت بار ہولہ میں اپنے گھر کے مانوس اور مسرت انگیز ماحول میں سانس لے رہے تھے، وہ بھی بڑی مدت کے بعد امرتسر سے گھر جا رہے تھے، اور انہوں نے کل رات مجھے سنایا تھا کہ ان کی گھر والی نے آٹھویں بچے کو جنم دیا ہے۔ اس بار ان کی گھر والی نے واہگرو کی کرپا سے نئی زندگی پائی ہے۔ وہ جلد سے جلد گھر جانا چاہتے تھے امرتسر میں وہ فروٹ کا کاروبار کرتے تھے۔ ـــــ اور یہ لحاف،

میں چھپے ہوئے اکہرے بدن کے دبلے پتلے آدمی پریم کمار، جو ذرا ذرا سی بات سے پریشان ہوتے ہیں، متوحش ہوتے ہیں، اور دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ نہ جانے اپنی نیندوں میں کیسے کھوج رہے ہیں۔ شاید وہ وادی کی البیلی، حسین اور رنگین بہاروں کے ریشمی آنچل سے کھیل رہے ہیں، کل، رات گئے تک وہ کہتے رہے۔

مجھے کشمیر سے پیار ہے، اس کی بہاروں سے پیار ہے، میں نشاط اور شالیمار کو دیکھنا چاہتا ہوں، میں چناروں کے دیس میں کھو جانا چاہتا ہوں، کیا چناروں کے سائے تلے تھکے ہوؤں کو نیند آتی ہے۔! کیا خزاں کے دنوں میں چناروں میں آگ لگتی ہے؟ جب آگ لگتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔؟ میں نے تو جناب یہی سنا ہے۔ بچپن سے اور یہ باتیں ایک خواب بنکر میرے آنکھوں میں بسی ہیں، میں بچپن سے یہ خواب دیکھتا آیا ہوں ـــــ لیکن برا ہو آجکل کی مصروف زندگی کا، یہ زندگی نہیں مصیبت ہے، کمر توڑ گرانی، ہر وقت مالی مشکلوں کا چکر، یہ چکر بھی عجیب چکر ہے۔ وہ تو کہئے کہ ایک چانس نکل آیا زندگی میں، زندگی میں صرف چانس ہی ایک چیز ہے۔ ایک حقیقت، باقی تو سارا معاملہ غیر یقینی ہے، کیوں رفیق صاحب؟ ابھی دیکھیے، میں عمر بھر کشمیر آنے کو آرزو کرتا، لیکن یہ آرزو آرزو ہی رہتی، ایک چانس نکل آیا، گورنمنٹ نے مجھے آفیشل کام پر... سرینگر جانے کو کہا، ٹی۔ اے، ڈی۔ اے ملے گا، اندھا کیا چاہے

دو آنکھیں ـــــ دفتر کے کچھ ساتھیوں نے کہا، کہاں جاؤ گے اس موسم میں؟ وہاں تو سخت ٹھنڈ ہوگی، ہم نے کہا، حضرت، یہ چانس بار بار نہیں آتا زندگی میں، ہم کشمیر جاکر خزاں میں ہی بہاروں کا لطف اٹھائیں گے، کیٹس کی نظم ODE TO AUTUMN پڑھی ہے کالج میں، اب بھی یاد ہے وہ آپ نے بھی پڑھی ہوگی، مشہور نظم ہے، آخری بند میں وہ کہتا ہے۔

WHERE ARE THE SONGS OF SPRING THINK NOT OF THEM YO HAVE YOUR OWN MUSIC

اور جب میں نے کہا، سری نگر میں اس وقت سردی ہوگی، تو وہ بے کیف سی ہنسی ہنس کر بولے، کیا فرق پڑتا ہے، ہم تو اپنے خوابوں کی وادی کو دیکھیں گے، کسی روپ میں سہی، ہماری آرزو تو پوری ہوگی۔ اور اگر ہمارے قیام کے دوران برف گری تو ـــ تو کیا ہم اپنی آنکھوں سے برف کا نظارہ دیکھیں گے؟ یقین نہیں آتا ـــ

دیکھ لے اب برف کا نظارہ ـــــ حیدر!! اب آنکھیں کیوں نہیں کھولتے پریم کمار صاحب؟ اٹھئے آپ کی دعا سننے ہی میں قبول ہوگئی، اب جی بھر کر برف کا لطف اٹھایئے، جتنا لطف چاہیں اٹھائیں ـــــ میں نچلے ہونٹ کو چباتے ہوئے پھر بستر میں گھس گیا، سارا بستر برف ہو چکا تھا، اور میرے خیالوں پر ... کی

یخ بستہ چادریں پھیل رہی تھیں!

دوسرے کمرے میں سردار جی بلند آہنگ لہجے میں فلمی گیت گانے لگے،

یہ رات بڑی متوالی ہے، یہ رات بڑی متوالی

میں نے گھبرا کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس دیں،

●

اور دن کے دو بجے ہی بستر سے نکلا، بھوک سے میرا برا حال ہو رہا تھا، دو بجے تک کا وقت میں نے سوتے جاگتے گذارا تھا، صبح کو بعد میں جب پریم کمار اور سردار جی بستر سے اٹھے، اور غیر متوقع طور پر برف دیکھ کر چلائے، تو میں اس وقت بھی رضائی میں سر چھپائے دبکا لیٹا رہا، مجھے یاد ہے کہ پریم کمار ننگے پاؤں کھڑکی کی جانب لپکے تھے، اور سفید سفید برف کے انبار دیکھ کر حیرت اور مسرت سے چیخ اٹھے۔

"یہی برف ہے، اتنی ساری ـــــ ارے ـــــ"

اور پھر سردار جی مایوسانہ اور بجھے بجھے لہجے میں انھیں برف کے اسرار و رموز سمجھاتے رہے، وہ بار بار کہہ رہے تھے۔

"پادشاہو، یہ برف نہیں کھد اسکا کہر ہے ـــــ کہر، سمجھو، ہماری شامت آگئی، اب تو جان کے لالے پڑ گئے، اب گھر دو جی ہی کہر پار کریں، نہیں تو مر گئے۔"

اور جب پریم کمار کے خیالوں میں اجلی اجلی برف کی رومانویت کافور ہو گئی، تھوڑے ہی وقت کے بعد، سردار جی سے پوچھنے لگے،

"راستے میں اس برف پر گاڑی چل سکتی ہے نا؟"

"ہاہا ——" سردار جی کی تلخ ہنسی کمرے میں گونجی، "آپ راستہ کی بات کرتے ہو پادشاہو، سمجھو راستہ گیا، اور ہم نہ جانے کتنے دنوں کے لئے پھنس گئے ——"

"اچھا جی ——!" پریم کمار کی حیرت کا جذبہ زخمی تھا، لہو لہان!

دونوں باتیں کرتے رہے،

اور مایوسی مجھے اتنی دور لے گئی تھی کہ ان کی باتیں، دور کسی گھنے جنگل میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح معلوم ہو رہی تھی،

اور پھر سوتے جاگنے کا وہ طویل وقفہ ——

طویل، بے کیف، روح فرسا!

میں شاید اب بھی بستر سے نہ اٹھتا، لیکن پیٹ کی آگ کو کیا کروں؟ پیٹ میں سچ مچ آگ سی جل رہی تھی۔

میں اٹھا، میرا دماغ چکرایا۔

کچھ دیر میں گم سم کھڑا رہا۔

برف کے طوفان نے سارے پروگرام کو تہس نہس کر دیا تھا، اب آئندہ پروگرام کے بارے میں نئے سرے سے سوچنا پڑے گا!

سب سے پہلے میں نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی، میرے پاس

اس وقت کل نقدی پندرہ روپے اور چند آنے تھے، اور دوسرا فوری اہم مسئلہ تھا رہائش کا۔

گرو جی کے چرنوں میں جو سکون تھا، وہ برف کے طوفان نے غارت کر دیا تھا، وہاں رات کاٹنا اب سیدھے موت کو دعوت دینا تھا، اس وقت کمرے میں اتنی سردی تھی، کہ اللہ کی پناہ، میرے تو دانت سے دانت بج رہے تھے، اور بستر کپڑے تھے، خواہ پہننے کے یا اوڑھنے بچھانے کے سب پانی ہو گئے تھے۔ یخ اور سرد ہوا کے برفانی جھکڑ چل رہے تھے، جو ہڈیوں تک کی خبر لے رہے تھے ——

میں اس مسئلے پر شدت کے ساتھ سوچنے لگا، کسی دکان میں جگہ ملنا مشکل ہے، ڈاک بنگلے میں تو باتھ روم بھی ریزرو ہو چکا ہے۔ کہیں اور رہنے کی جگہ نہیں، پھر کہاں جاؤں؟ —— مسجد میں؟ ایک خانۂ خدا سے نکل کر دوسرے خانۂ خدا میں؟ لیکن وہاں جانا بھی مناسب نہیں، وہاں کمرہ گرم تو ہے، لیکن اس کی کھڑکی ہی نہیں، صرف ایک بڑا دروازہ ہے، لیکن دروازے پر کوئی تالا نہیں لگا ہے، اور جب کل میں نے دین محمد سے وہاں سو رہنے کا ذکر کیا، تو اس نے طنزیہ انداز میں کہا، ضرور وہاں جایئے، اور آرام کیجیے خدا کے گھر میں، خدا کے گھر میں خوب نیند آئے گی، اور صبح جب نیند ٹوٹے گی تو وہاں نہ جناب کا جوتا ہوگا نہ سوٹ کیس —— یہ

خدمت آپ کے لئے کوئی بندہ خدا انجام دے گا، کوئی نمازی پچھلے سال بھی ایک مومن وہاں سویا تھا، نماز عشاء کے بعد اس نے تہجد کی نماز بھی ادا کی تھی، پھر جب اس کی آنکھ لگی ہوگی تو سیدھے جنت میں حوروں کے جھرمٹ میں پہونچا ہوگا، اور صبح سویرے جب اس کی نیند ٹوٹی تو روتے روتے میری دکان میں آیا، اور اس کو چائے کی ایک پیالی کے لئے بھی پیسے نہ تھے، پوری صفائی کی گئی تھی اس کی، یہ کہکر دین محمد خاموش ہوگیا، اور میں نے مسجد میں جانے کا خیال بالکل چھوڑ دیا تھا، اسی وقت ——— پھر میں کہاں جاؤں

اسی ادھیڑ بن میں کمرے سے نکلا اور قدموں سے برف کی دبیز تہوں کو چیرنے لگا، میرے پاؤں برف کی تہوں میں دھنس رہے تھے، اور برف چرچرا کر دب جاتی، چلتے چلتے میری ٹانگیں گھٹنوں تک برف میں چھپ جاتیں، اور برف کے ٹکڑے جوتے کے اندر پانی میں تبدیل ہو رہے تھے، میں بڑی احتیاط سے ناہموار راستے کی نشیبی سطح سے نیچے سڑک پر آیا، چادر اور ٹوپی پر کافی برف جمع ہوگئی تھی ——— اور برف گر رہی تھی!

برف تیزی گر رہی تھی!

میں نے برف جھاڑ دی، اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے چلنے لگا۔

بائیں جانب بسیں اور مال گاڑیاں برف کے بڑے بڑے تابوت

بن کر کھڑی تھیں۔

میں تیز چل رہا تھا، میری سانس پھولنے لگی۔

"ریمیک صاحب ___ آئیے بادشاہو۔ کہاں کے ارادے ہیں" سردار جی کی آواز گرجتی ہوئی برف کو چیرتی ہوئی میرے کانوں سے ٹکرائی، میں نے فوراً ان کی آواز پہچان لی۔ نظر اٹھائی بائیں طرف، وہ ایک سردار کی دکان میں چولہے میں جلتی ہوئی لکڑیوں سے اپنے پاؤں کو گرمی پہنچا رہے تھے، مجھے سردار صاحب کی بے وقت کی آواز بڑی کرخت، اور بری محسوس ہوئی، لیکن از راہِ مروت مجھے رکنا پڑا۔

"آئیے صاحب چولہے کی آگ تاپئے ___ سردار جی کی بغل سے پریم کمار کی سہمی ہوئی، سمٹی ہوئی آواز ابھری، وہ ٹھٹھرے ہوئے، سکڑے ہوئے چولہے سے تقریباً چمٹ گئے تھے۔

میں نے کہا۔

"میں ذرا آگے جاتا ہوں، بس ابھی آیا ___ ابھی ___"

"کہاں جائیں گے بادشاہو۔ اس وکت آگ تاپنے میں مزا ہے اور بس ___"

"میں تار گھر تک جا رہا ہوں ___" اچانک مجھے یاد آیا

"واہ بادشاہو، یہ بھی کھوب کہی ___ وہ کہاں تار یا

ٹیلیفون ۔۔۔۔ سب تار گر گئے ہیں، کھمبے ٹوٹ گئے ہیں، ہم لوگ تو دس بجے ہی صبح وہاں کے حکیر کاٹ کے آئے ہیں۔

میرا جسم سن سے رہ گیا، تار اور ٹیلیفون کے سلسلے بھی ٹوٹ گئے ہیں اب کیا ہوگا؟ گھر والوں کو کیسے اطلاع دی جائے۔ اور اگر زیادہ دن یہیں پڑے رہے، اور جیب خالی ہوگئی، تو ۔۔۔۔؟

اس وقت میری جیب میں چند روپے ہی باقی رہ گئے تھے، لکھنؤ سے روانگی سے پہلے میں نے کئی سو روپے کا منی آرڈر گھر بھجوا دیا تھا، دو تین سو روپے کی SHOPING کی تھی اپنے لئے ایک نئی روسی گھڑی خریدی تھی۔ ایک خوبصورت سی گھڑی، ایک سو پچیس روپے کی، سوٹ کے لئے قیمتی کپڑا خریدا تھا، اور بہن بھائیوں کے لئے چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدی تھیں، ایک اور تحفہ بھی میں نے خریدا تھا، اور یہ تحفہ ہفتوں کی تلاش کے بعد ملا تھا ۔۔۔۔ یہ تحفہ رشمی کے لئے تھا۔

اور جموں تک پہنچتے پہنچتے میں نے خوب روپیہ خرچ کیا، شاندار کھانا کھایا۔ اور جموں سے سرینگر روانہ ہوتے وقت میرے پاس سولہ سترہ روپے نقد تھے، کافی پیسہ تھا، ایک دن کا ہی تو سفر تھا، اور صرف دن کا کھانا راستے میں کھانا تھا، زیادہ سے زیادہ دو تین روپے خرچ ہوتے، اور بس ۔۔۔۔!

لیکن اب موسم نے ایسا رخ بدلا تھا کہ ـــــــ

میں بے بسی کی ایک عجیب سی منزل پر کھڑا تھا،

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" سردار جی نے مجھے پھر چونکایا،

"کچھ کھانا چاہتا ہوں، صبح سے کچھ کھایا نہیں ـــــــ" میں نے

سچ بولنے ہی میں جان کی خیر سمجھی۔

"اچھا تو آپ اس وقت تک اوپر کمرے میں ہی رہے! تعجب ہے؟"

پریم کمار کا اظہار حیرت مجھے ناگوار گذرا۔ اس چوہے سے مجھے

سخت نفرت ہو رہی تھی۔

میں اب ان کی طرف دیکھے بغیر آگے چلا، اور سیدھا

دین محمد کی دکان میں گھس گیا،

دین محمد کی دوکان میں لوگ خاموش بیٹھے تھے،

کچھ لوگ جمائیاں لے رہے تھے، کونے میں دو آدمی اونگھ رہے

تھے، قلندر گردن کو اوپر اٹھا کر باہر کی برف آلود فضاؤں

کو اپنی زرد وحشت بھری آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

"میرا خیال ہے۔ اتنی برف پہلے کبھی نہیں گری ہے ــــ" خواجہ

صاحب کہہ رہے تھے۔

"میں نے کہا، آپ کا خیال اصلیت کو کیسے بدل سکتا ہے...

خواجہ صاحب ـــــــ" دین محمد نے اسے ٹوکا۔

"کیا مطلب؟" وہ تنک کر بولے۔

"کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے، پرانی باتوں کو بھول جانے کی، ہم نے اپنی آنکھوں سے اس سے زیادہ برے دن دیکھے ہیں، ایک بار نہیں کئی بار ——"

میاں خلیل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں دین محمد کے خیال کی تائید کی۔ اور ان کو باتوں میں مصروف دیکھ کر حقہ کے دو چار کش لگائے، دکان میں آج بھی تیسرا آدمی کام کر رہا تھا، جو آٹا گوندھ رہا ہے، چولہے پر چار پانچ ہانڈیاں لگی تھیں، بھاپ اٹھ رہی تھی، آگ دہک رہی تھی، اور بہت سی چیزیں پک رہی تھیں!

میاں خلیل نے میرے لئے چار چپاتیاں لائیں، اور سبزی کا آدھا پلیٹ، اور میں تمام پریشانیوں کو بھول کر پیٹ کی آگ بجھانے لگا۔

●

میں ڈاک بنگلے کے اس چھوٹے سے تکونے کمرے میں
بیٹھا تھا، جس کے ایک طرف پرویز کا بیڈ تھا، اور بیڈ پر بکھرے
ہوئے کچھ پرانے اخبارات، چوکیدار نے میلے سے بوسیدہ رجسٹر میں
میرا نام مجھ سے ہی لکھوایا تھا اس کمرے میں ایک منجی کا دو روپیہ
ادا کرنا تھا، اور وہ چوبیس گھنٹے کا پیشگی کرایہ وصول کر چکا تھا
دو روپیہ یک مشت ادا کر کے میں بدحواس ہو گیا، آئندہ میں کمرے
کا کرایہ ادا کروں کہ پیٹ کے جہنم کو بجھانے کا سامان کروں؟
عجیب الجھن کا سامنا ہے۔

پرویز کے اس کمرے میں آنے کی مخلصانہ دعوت
کو میں رد کیسے کر سکتا تھا، جبکہ گوردوارے میں میری جان پر
آبنی تھی، میں نے فوراً رضامندی ظاہر کی۔ پرویز نے جو واپسی
جموں جانے کا پروگرام بنایا تھا، اور وہ کل صبح ہی پٹنی ٹاپ
کراس کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، اس وقت وہ اسی سلسلے میں
کہیں باہر گیا ہوا تھا۔

بوڑھے چوکیدار کو کرایہ ادا کر کے میں اٹھا تاکہ گوردوارے

سے بستر لے آؤں

"آپ جائیے کمرہ آپ کا ہو گیا ———" اس نے کہا، اور میلی سی رضائی کو سینے سے لگا کر برآمدے میں چلا گیا۔

میں جانے ہی لگا تھا کہ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور دروازے پر وہ عورت، کیا نام بتایا تھا پرویز نے اس کا...؟ ——— ہاں یاد آیا، کماری ——— وہی تو تھی سمٹی سمٹائی کیا اسے پتہ چلا کہ میں اس کے بغل والے کمرے میں آ گیا ہوں؟ پرویز کے ساتھ ٹھہرا ہوا جموں کا ایک دوکاندار گیارہ بجے واپس کد روانہ ہو چکا تھا، پیدل کیونکہ اس نے سویرے ہی برف کا طوفان دیکھ کر اعلان کیا تھا کہ اب ہفتوں تک راستے کے ٹھیک ہونے کا امکان نہیں، پتنی ٹاپ تک پیدل چلا جائے اور کد سے کوئی کار پکڑی جائے تو جموں پہنچ جانے کی ایک صورت ہے، ورنہ یہیں بٹوت میں پڑے رہو۔ اس کا اعلان سنکر ڈاک بنگلہ میں ایک جوڑی، دو مزدور، ایک ڈرائیور، اور تین افراد، پتنی ٹاپ پیدل کراس کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور وہ اسی وقت روانہ ہو گئے۔ بستر، سامان وغیرہ وہ اپنی بس کے ڈرائیور کے حوالے کر گئے تھے۔ پرویز بھی پہلے تیار ہوا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے کل تک کے لئے ارادہ ملتوی کر رکھا۔ یہ سب حالات مجھے بوڑھے چوکیدار نے اپنی سیاہ آنکھوں پر سفید پلکوں کو بار بار جھپکاتے ہوئے سنائے، اور میں حیران تھا کہ ان لوگوں نے ایسا خطرناک قدم کیوں اٹھایا۔ پتنی ٹاپ

پر گری ہوئی برف پہلے ہی سنگلاخ بن چکی تھی، اور پھر آج رات وہاں پھر زوروں کی برف باری ہوئی۔ اتنی بلندی پر پیدل چلنا اور وہ بھی پہاڑی راستے پر جان جوکھوں میں ڈالنے کے برابر ہے۔ اوھر دین محمد کی دوکان پر میجر ملک ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ وہ... ٹریننگ یافتہ نوجوان بانہال کی طرف پیدل چلے گئے ہیں، نانی مرجائے گی ان سالوں کی، میجر ملک نے کئی گالیوں سے ان کو نوازا ——
توبہ، سچ مچ وہ بھی جان بوجھ کر موت کے منہ میں چلے گئے ہیں، اللہ خیر کرے!

میں کماری کی طرف دیکھ کر آگے بڑھا، وہ اب بھی دروازے پر کھڑی تھی، مجھے دل ہی دل میں خوشی ہوئی کہ وہ مجھے دیکھ کر رنجیدہ نہ ہوئی۔ مجھے ایسا لگا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن میں اس سے دوبارہ نظریں ملا نہ سکا، اور آگے چل دیا۔

ڈاک بنگلے کے احاطے میں سناٹا تھا۔ درختوں کی سفید سفید شاخوں سے کوئی آوارہ پرندہ پھر سے اڑ جاتا، اور برف کے شگوفے جھر جھر شاخوں سے جھڑ جاتے، بکھر بکھر جاتے۔ کوئی انسان نظر نہیں آرہا تھا، سب لوگ کمروں میں چپ چاپ بیٹھے تھے، اور وہ ایکٹریس ——؟ وہ بھی کمروں میں دبکی بیٹھی تھیں، چوکیدار نے بتایا کہ صبح جب ان لوگوں نے برف دیکھی، تو وہ ناچنے لگے، تالیاں بجانے لگے اور انگریزی گیت گانے لگے، وہ برف میں کھیلتے رہے، ایک دوسرے

میں برف کے گالے پھینکتے رہے۔ فوٹو کھینچتے رہے۔ تھوڑی دیر تک یہ جوش رہا۔ لیکن جلد ہی وہ سردی سے تھر تھر کانپنے لگے، ان کے دانت بجنے لگے، اور وہ اپنے کمروں میں گھس گئے، اور جب سے انہوں نے باہر قدم بھی نہ رکھا۔

میں جلدی سے گوردوارے آیا، خدا کا شکر ادا کیا کہ کمرے میں سردار جی اور پریم کمار موجود نہ تھے، میں نے جلدی سے بستر باندھا، اور ایک دکان سے اپنے ساتھ لائے ہوئے ایک گوجر کو یہ بستر وغیرہ اٹھانے کو کہا۔

آدھ گھنٹے میں، میں ڈاک بنگلے کے بند کمرے میں بستر پر دراز تھا، میری ٹانگوں میں ایک لوٹی پھوٹی کانگڑی تھی، جو میں نے اسی گوجر سے بارہ آنے میں خریدی تھی، اس میں آگ بھر کے لایا تھا دین محمد کی دکان سے ایک گھنٹہ تک میں بستر میں رہا، اور جسم کو خوب گرمی پہونچائی مجھے اب بازار جانے کی کوئی فوری ضرورت نہ تھی، دو ڈھائی بجے میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا، اور اب بھی میرا پیٹ بھرا تھا، اور اسی پر رات کا گذارہ چلانے کا خیال تھا۔

میں نے انگڑائی لی، اور بستر سے اٹھا، اور کانگڑی لے کر باہر برآمدے پر آیا۔ میرا جسم آسودگی اور گرمی سی محسوس کر رہا تھا، برف اس وقت نہیں گر رہی تھی، جنگلی کوؤں کی چائیں چائیں مختصر وقفوں کے بعد گذر جاتیں، فضا کی یخ آلود خاموشی میں بھنور پڑ

ہمارے:۔

سامنے دور تک پہاڑوں کے سفید نشیبی سلسلے برفیلی دھند میں روپوش ہو چکے تھے،

میں اس برفیلی دھند میں کھو سا گیا، اس دھند میں کتنے مہربان چہرے ابھرے تھے، کتنی مہربان اور محبت آگیں صورتیں۔ روٹھے ہوئے خفا خفا سے، لیکن آنکھوں سے شفقت کی کرنیں برساتے ہوئے! ـــــ یہ مہربان، نرم اور پیارا چہرہ میری امی کا ہے۔ اس کی پلکوں کی اوٹ میں ممتا کے آنسوؤں کی نمی کانپ رہی ہے۔ اس کے دل سے آہوں کا دھواں اٹھ رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر اپنے بیٹے کی سلامتی کے لئے کتنی دعائیں کانپ رہی ہیں۔ یہ آج تک افلاس اور تنگدستی سے مقابلہ کرتی رہی ہے اور ہر نماز پر دعا کرتے وقت اتنے آنسو بہاتی رہی ہے کہ اس کی بینائی کمزور پڑ گئی ہے! کمزوری اور نقاہت کے باوجود یہ رات گئے تک چرخہ کاتتی ہے اور گھر کے خرچ چلاتی ہے۔ اور یہ سیاہ نرشی ہوئی داڑھی اور بے شمار جھریوں والا بزرگ چہرہ میرے والد صاحب ہیں، جن کی عمر لگ بھگ پچاس سال کی ہے لیکن جو اسی برس کے بوڑھے سے زیادہ لاغر اور نحیف نظر آتے ہیں، ساری عمر یہ درزی کا کام کرتے رہے، اور اب ان کی کمر بھی دہری ہو گئی ہے۔ اور اب دائم المرض بن کر رہ گئے ہیں ہر وقت کھانسی اور بلغم کے دائمی مرض سے دست و گریبان

—— اور یہ میری دو چھوٹی بہنیں ہیں، دونوں سکول جاتی ہیں، دونوں مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں، میرا خیال رکھتی ہیں، سردیوں میں میرے لئے صبح سویرے ہی آگ سے بھری ہوئی کانگڑی لاتی ہیں، کمرے میں جھاڑو دیتی ہیں، کتابوں کو ترتیب سے رکھتی ہیں، چیزیں سنبھال کر رکھتی ہیں —— اور یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ ساتویں میں پڑھتا ہے، موٹا سا تربیل سا لڑکا، لیکن بڑا شریر، ہر وقت اپنی بہنوں سے جھگڑا کرتا ہے، ان کی چوٹیاں کھینچتا ہے، اُن کی دوات کی سیاہی گرا دیتا ہے۔ کتاب کے ورق پھاڑتا ہے، اور خود ہی باپ کے پاس جا کر رونی صورت بنا کر شکایت کرتا ہے کہ اُسے پیٹا گیا، اور والد صاحب بستر ہی سے دونوں بچیوں کو بد دعائیں دیتے ہیں ——

اور —— اور یہ سب عزیز اور شفیق —— میرے چچا جان، چاچی ان کے بچے —— ہمارا گھر ایک بڑا گھر ہے، سب لوگ اکٹھے رہتے ہیں محبت اور شفقت سے ایک دوسرے کے غم میں شریک، ایک دوسرے کی مسرتوں کے ساتھی، اور یہ چہرہ —— لانبی سیاہ پلکوں پر انتظار کے دیئے جلائے ہوئے، یہ چہرہ جو ہر وقت میری نگاہوں میں بسا رہتا ہے۔ یہ رشی ہے، میری اپنی رشی، میرے خوابوں کی رانی —— ارے تم سچ مچ مجھ سے روٹھی ہو، تم مجھ سے آنکھ بھی نہیں ملاتی ہو، تمہارا حسن اداس ہے، دیکھو، میری طرف دیکھو، پلکوں کی چلمن اٹھا دو، تم سچ مچ خفا ہو مجھ سے؟ میں نے تمہیں خط نہیں لکھا؟ تمہاری شکایت

بجا ہے، یہ خاموشی تو پیار کی شکایت ہے اور شکایت کا یہ انداز کتنا پیارا ہے۔ کتنی اپنائیت ہے اس میں، اپنوں سے ہی تو شکایت کی جاتی ہے۔ ارے، تمہاری پلکوں کی ریشمی چلمن اٹھ رہی ہے۔ تو تمہارے چہرے پر مسرت کی صبح پھوٹنے لگی، دیکھو رشی، مجھے بھی تم سے شکایت ہے، تم نے پچھلے تین مہینوں سے مجھے بالکل بھلا دیا۔ میں تمہارے خط کو ترستا رہا، اف، میرے دل پر کیا گذری، روز خط کا انتظار، روز مایوسی ـــــ میرا خون جلا ڈالا مایوسی کی اس آگ نے، تم کہاں سے پتھر کا کلیجہ لائے، دوست؟ مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی ـــــ ارے تم میرے ان آنسوؤں کا خیال نہ کرو، آنسوؤں کا کیا ہے، بہے تو بہے، بکھر گئے، تو بکھر گئے، آنسو ہی تو ہیں، یہ شاعر لوگ پاگل ہو گئے ہیں، جو آنسوؤں کو موتی سمجھ کر ان کے لئے کسی دامن کی آرزو کرتے ہیں ـــــ اچھا دیکھو، میری شرارت، اب میں نے تمہیں آنے کی اطلاع بھی نہ دی، تم کو ایک حسین SHOCK دینا چاہتا تھا۔ لیکن ـــــ لیکن تمہیں معلوم ہے، میں کہاں پھنس گیا ہوں کس مصیبت میں گھر چکا ہوں، کن ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں؟ دیکھو تو میری حالت، دو روز سے شیو نہیں بنایا ہے۔ کپڑے نہیں بدلے ہیں، حالت خراب ہو گئی ہے، برف کے طوفان نے بے رحمی سے گھیر لیا ہے، اور اب نہ جانے کتنے دنوں تک یہاں قید رہنا ہے ادھر تو جیب میں بس اللہ کا نام ہے، رشی، دیکھو ساری خفگی

چھوڑو، نہیں میری قسم، اب تم بہت جلد میرے گھر آؤ گی، میری دلہن بن کر ——— میں ایم۔اے کی ڈگری ساتھ لایا ہوں، اور ہاں رشی، مجھے وہاں اچھی نوکری ملی تھی، لیکن میں نے اس نوکری کو چھوڑ دیا، پردیس میں آدمی نوکری کیا کرے، یہاں تم ہو، تم — اور میرا گھر میرے عزیز، میں یہیں نوکری کر دوں گا۔ ہاں گھر بساؤں گا اور خواب کی ایک حسین دنیا ———

"میں نے کہا، یہ پرویز صاحب چلے گئے کیا" پیچھے سے ایک لچکیلی نسوانی آواز آئی،

میں نے دیکھا میرے نزدیک ہی کماری کھڑی تھی۔

اس کے پپوٹے بوجھل تھے، سرخی مائل، گھنی سیاہ پلکیں خمار آلود، سیاہ آنکھوں میں خوابوں کے سائے، بھیگے بھیگے، لرزاں لرزاں چہرے کی جلد میں گندمی رنگ کی نرمی اور ملائمیت، اور رسیلے ہونٹوں کے کانپتے ہوئے خم ——— اس کی ناک کی غیر ضروری لمبائی کا احساس اتنے حسن میں فوراً زائل ہونے لگا۔

وہ جیک اور کوٹ میں ملبوس تھی۔ دراز قد، بھرپور جسم کی عورت اس کے خشک الجھے الجھے بال اس کے گداز شانوں پر آوارہ تھے،

میں اسے دیکھتا رہا ——— ایک موزوں خدوخال اور دلنشیں رنگ والی عورت جب شباب کی آخری حدوں کو چھوتی ہے، تو اس

کے جسم میں کتنی قیامتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ غالباً اس سے پہلے ایک عورت کو میں نے جسمانی کشش کے اس قاتل روپ میں نہیں دیکھا تھا

"وہ صبح پیدل جانے کی سوچ رہے تھے ___"

میرے ہونٹوں کو گنگ دیکھ کر وہ خود ہی بولی،

"جی ___ جی ہاں ان کا ارادہ ہے، وہ صبح جا رہے ہیں ___"

"جا رہے ہیں! ۶ مائی گاڈ، اس موسم میں، بڑا رسک لے رہے ہیں وہ ___"

"پیدل چلنا واقعی بڑا رسکی ہے ___"

"اور کیا، ___ کچھ دیر سے برف گرنا بند ہو گئی ہے، شاید کل راستہ ___"

"کل کے لئے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ابھی نہ جانے کتنے دن لگیں گے، اور اگر برف پھر گرے تو ___"

"تو بڑی مصیبت ہو گی، کوئی الفاریشن بھی نہیں جا سکتی"

اس کے لہجے میں اب تشویش سی جھلکنے لگی۔

لمحہ بھر رک کر وہ بولی۔

"آپ سرینگر سے کب چلے ہیں؟

"میں تو ڈیڑھ سال کے بعد سرینگر جا رہا ہوں ___"

"اچھا جی؟"

"میں فرور سٹیڈیز کے سلسلے میں لکھنؤ گیا تھا"

"I SEE"

مجھے حیرت تھی، اور مسرت بھی کہ وہ بالکل بے تکلفی سے میرے ساتھ ہمکلام تھی، میری نگاہیں اس کے خدوخال کی رعنائیوں کو چھو رہی تھیں، اب میں اس کے خمدار ہونٹ کے اوپر سبز! خط کی ہلکی سی باریک لکیر کو دیکھ رہا تھا،

قدرے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

"آپ جموں کس سلسلے میں گئی تھیں!۔

"میں ایک انٹرویو دینے گئی تھی"

"ہو چکا انٹرویو"

"جی ہاں"

"کیسا رہا؟"

میں بات کو بڑھانا چاہتا تھا، اور اس عورت کے دل کی گہرائیوں کو ٹٹولنا چاہتا تھا، جس کی ادھوری کہانی پرویز سنا چکا تھا،

"اچھا ہی رہا، لیکن ——— لیکن انٹرویو تو محض فارملٹی ہوتی ہے، اصل میں جس امیدوار کو وہ لگانا چاہتے ہیں، وہ پہلے ہی لگا ہوا ہوتا ہے،

اس کے لہجے میں بیزاری سی آگئی۔

"بالکل سچی بات ہے، ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے، جو DESERVE

کرتا ہے، اسے کون پوچھتا ہے——"

اتنے میں بوڑھا چوکیدار آگیا، پھٹا پرانا ملٹری کمبل اوڑھے ہوئے، دو میلی سی سفید مونچھیں اور سیاہ آنکھوں پر سفید پلکیں جھکائے ہوئے،—— مجھے اس کی اس وقت کی آمد بہت کھلی

"آج بھی چپاتی ہی لانا ہے جی؟" وہ بولا، سفید پلکیں بار بار جھپکتے ہوئے۔

"نہیں آج چاول لے آنا" وہ بولی "آجاؤ، میرے ساتھ، پیسے بھی لیتے جانا——"

یہ کہکر وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی، میری طرف ایک معذرت آمیز مسکراہٹ چھوڑ کر۔

شام کو دھند گہری ہو رہی تھی!

برف پوش ماحول ہلکے سیاہ رنگ کا حریری لباس پہن رہا تھا۔

میں کمرے میں آیا، بستر میں گھس گیا، اتنے میں پرویز آیا۔

"بھئی معاف کیجئے، آج سارا دن مصروف رہا، ڈی، ای سے ملا ٹریفک انسپکٹر سے بات کی، بھئی وہ سب لوگ کہتے ہیں کہ فی الحال دس دن تک راستے کے کھلنے کا کوئی امکان نہیں، ادھر سے برف گر رہی ہے، اور——"

"دس دن——؟" میری آواز میرے حلق میں رک گئی،

"میرا اندازہ ہے، اس سے زیادہ ہی دن اب لگیں گے——"

"آپ نے اب کیا آخری فیصلہ کیا ہے؟"

"بس یہی ——— اس نے سگریٹ سلگایا، اور ایک سگریٹ مجھے پیش کیا۔

"کل طویل مارچ کروں گا، اور بھی دو چار ساتھی ہیں ———"

"لیکن پرویز، یہ قدم بڑا رسکی ہے ———"

"رسکی تو ہے، لیکن یہاں یونہی پڑے رہنا زیادہ رسکی ہے یہاں زیادہ دن رہنا پڑے تو موت یقینی ہے۔ ادھر سے اپنے پاس زیادہ روپیہ بھی نہیں ——— ویسے واپس پیدل چلنا رسکی بھی کیا ہے۔ چلنا تو صرف بتنی ٹاپ تک ہے، کدھ سے موسم ٹھیک ہو گا۔ وہاں برف نہیں گرتی، وہاں سے "CONVEYANCE" لے گی، اور جموں جا کر بیٹھ جایئے مزے سے، میں "منزل" کا پہلا اڈیشن وہیں سے نکالوں گا۔ آپ چاہیں تو چلیے ہمارے ساتھ ———"

"نا بابا، میں یہیں جان دے دوں گا، لیکن پیدل ایک میل بھی نہیں چل سکوں گا، اس برف اور سردی میں ———"

"آپ مرد ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں، تعجب، آج صبح ایک صاحب پیدل گئے، اور ان کے ساتھ ان کی نازک اندام بیوی بھی گئیں ——— بھئی بڑی نازک عورت تھی، میں نے دیکھا اسے، اب تک وہ جموں پہنچ گئے ہوں گے، یہاں تو ان کی حالت خراب ہو جاتی، سبھوں کی نظریں اس پر گڑی تھیں ———"

"کیا مطلب ؟"

آپ کو نہیں معلوم، خوب اچھا خاصہ سکینڈل ہو گیا، سبھی سب جانتے ہیں وہ بیچارے کیوں یہاں سے بھاگ گئے ——"

"آخر ہوا کیا، کچھ تو کہو ہی ——"

"ہونا کیا تھا ——" اس نے سگریٹ کا لمبا کش لے لیا اس کا خاوند اپنے کو کاروباری آدمی کہتا ہے۔ اور مجھ سے کہتا تھا کہ جموں میں اس کے بھائی کا ہوٹل ہے۔ شام کو اپنے لئے اور بیوی کے لئے کھانا لانے بازار تک گیا تھا، اور کسی دکان پر بیٹھا گپ بازی کر رہا تھا، ادھر اس کی بیوی کے کمرے میں دو آدمی داخل ہوئے شراب کے نشے میں دھت، اور لگے اس سے زبردستی کرنے، اس نے شور مچایا، تو ایک آدمی نے بڑھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسنا چاہا، عورت نے اسے کاٹ لیا، اور آسمان سر پر اٹھایا، اتنے میں پاس والے کمرے کے لوگ گئے، اور وہ دونوں آدمی بھاگ گئے۔ میں اس وقت پہونچا جب وہ دونوں رفوچکر ہو چکے تھے، کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ ڈرائیور تھے، شراب پیئے ہوئے، کوئی کہہ رہا تھا ملٹری والے ہیں۔ کچھ لوگ بعد میں کہہ رہے تھے کہ انہوں نے جبراً عورت کی عصمت لوٹ لی ہے، عورت کے چہرے پر کئی دھبے پڑ گئے تھے، بہر حال! جتنے منہ اتنی باتیں، میں نے عورت کو خوب تسلی دی، اور جب سب چلے گئے، تو ان کے شوہر نامدار گنگناتے ہوئے آ گئے، میں اس

وقت اپنے کمرے میں آرہا تھا' ــــــ اور وہ بیچارے آج صبح ہی واپس جموں جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے' ــــــ"

میں حیرت زدہ یہ کہانی سنتا رہا۔

واقعی ایسے غیر یقینی حالات میں انسان کی عزت و آبرو بھی معرض خطر میں پڑ سکتی ہے' اور انسان کے لئے یہ خطرہ انسان ہی کا پیدا کیا ہوا ہے' انسان ــــــ

سفاک' بے رحم جانور ــــــ

"آپ حیران ہوئے ہیں یہ سنکر ــــــ" پرویز نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر کہا ــــــ" اس سے زیادہ حیرت کی بات سنا دونگا"۔

میں ہمہ تن گوش تھا

"یہ جو ایکٹریسیں ہیں' یہی مدراسی ایکٹریسیں ــــــ؟"

"ہاں ہاں ــــــ"

"جانتے ہو آج کیا ہوا؟"

"نہیں تو ــــــ"

"آج ایک ایکٹریس سردی سے بیمار ہوگئی' وہی چھوٹی سی' جو سوئٹر اور ہیٹ پہنے پھرتی تھی' ــــــ"

"اچھا؟"

"ملٹری ڈاکٹر آیا تو اس نے کہا اسے EXPOSURE ہو گیا ہے۔ اس کے بدن کو زیادہ سے زیادہ گرمی پہنچا دی جائے' نہیں

تو اسے PARALYSIS کا خطرہ ہے۔ اب کیا تھا سب ایکٹریسیں پریشان، بدحواس ـــــ گانا وانا سب ایک دم بھول گئیں، اور آج دن بھر صرف وہسکی کی آگ پیتی رہیں۔ یہ دو دن بھی انہوں نے صرف وہسکی کے سہارے گذار دیئے، ورنہ یہ سب ہی عورتیں اور مرد جم کر رہ جاتے ـــــ سب بدمست پڑے ہیں اپنے بستروں میں، اور یہ جو مرد ہیں ان کے ساتھ ان کے منہ سوکھ گئے ہیں۔ میں نے سنا کہ رات کو دو ایکٹریسیں نزدیک ہی کہیں دعوت پر گئی تھیں، اور پھر ساری رات وہیں رہیں۔

"اوہ، یہ بات ہے!"

"پتہ نہیں، ابھی اور کیا گل کھلائیں گے یہ لوگ ـــــ آج شام تو میں ان سے ملنے جا رہا ہوں، سبھوں نے آنے کے لئے اصرار کیا ہے، شاید ڈرتی ہیں مجھ سے، اخبار کے ایڈیٹر سے ـــــ ہاہا ـــــ خوب IMPRESS کیا ہے، میں نے ان کو ـــــ"

"بھئی ضرور جاؤ تمہارے نصیب جاگے ہیں، ایڈیٹر ہو نا۔ ہم عام لوگ تو ایک ایکٹریس کو دور سے ہی دیکھ لیں تو بڑی بات ہے تم پر تو یہ لوگ خوب مہربان ہیں ـــــ"

میں اٹھا، اور میں نے لائٹ آن کی، کمرہ روشنی سے جگمگا اٹھا میں نے پرویز کے سرہانے سے کرشن چندر کا ایک تازہ ناول اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

پر دیز تھوڑی دیر تک کچھ کاغذات کو دیکھتا رہا، پھر
کر، نے انہیں فائل میں رکھ دیا۔ کچھ کپڑے ٹرنک میں ڈال دیئے۔ وہ
کچھ اور چیزوں کو سمیٹ رہا تھا، میں نے سوچا کہ فی الحال ناول پڑھ
وں کہ اتنے میں مجھے کماری کا خیال آیا۔

"بھئی آج کماری جی سے خوب باتیں ہوئیں"

"اچھا، یہ کب؟"

"ابھی تمہارے آنے سے پہلے ——"

"کیوں وہ آگئی تھی یہاں؟"

"نہیں، میں برآمدے پر تھا، وہ آگئی وہاں ——"

"کیسی عورت ہے؟"

"بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتی ہے"

"وہ ہر معاملے میں بے تکلف واقع ہوئی ہے" پرویز کے ہونٹوں
پر شریر مسکراہٹ آگئی۔

"سچ؟"

"ایک دو بار ملو اس سے خود ہی پتہ چلے گا ——"

"بھئی چھوڑو یہ مذاق —— یہ بتاؤ اس کی شادی ہوئی تھی؟"

"اس نے لو میرج کی، ایک اور سیر کے ساتھ، اور سیر نے اسے
ریڈیو پر سنا تھا، اور کئی موسیقی کے پروگراموں میں دیکھا تھا، اور
وہ دل ہار بیٹھا تھا، پھر وہ ملا اس سے، اور کماری بھی اس پر لٹو ہوگئی

بات کماری کے پتاجی تک پہونچی، اور پھر ان کی شادی ہوئی ــــــ"

"پھر ـــــــــ؟"

"لیکن ایک ہی برس میں دونوں میں جھگڑا ہوا۔ اور کماری خاوند کا گھر چھوڑ کر میکے رہنے لگی، ہمسایوں کا کہنا ہے کہ اور سب کو کماری کے کریکٹر پر شبہ ہوا ــــــ"

"وہ کیسے؟"

"ہوا یوں کہ ایک شام کہیں پر موسیقی کا پروگرام تھا کماری بھی گئی تھی، اس کا خاوند ساری رات گھر میں اس کا انتظار کرتا رہا، لیکن وہ نہ آئی، وہ ساری رات نہ آئی، اور دوسرے دن صبح آئی کہتے ہیں، کماری رات کی غیر حاضری کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکی اور اس کا خاوند بدظن ہو گیا، پھر طرح طرح کی افواہیں پھیلی کہا جاتا ہے کہ وہ پروگرام پیش کر کے گھر لوٹ رہی تھی کہ چند آدمی اسے زبردستی اٹھالے گئے، اور رات بھر وہ اس سے گلمرگ میں دادِ عیش دیتے رہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سنگیت اکاڈمی کے منیجر سے اس کے ناجائز تعلقات تھے، اور اس رات بھی اس کے ساتھ ہارون گئی تھی ــــــ اس کے بعد اس نے لاکھ چاہا تھا کہ خاوند سے صلح کرلے، لیکن وہ تیار نہ ہوا، پھر وہ سرینگر چھوڑ کر کہیں دہلی میں ملازم ہو گیا۔ اب پھر سرینگر آیا ہوا ہے۔ شاید اب وہیں کام کرتا ہے ــــــ"

"اس نے دوسری شادی نہیں کی؟"
"کیسے کر سکتی ہے؟ اور پھر اس سے کون شادی کرے؟"
"ہاں بد نام جو ٹھہری ——"
"ہی) نہیں، اس کی بدنامی روز بروز بڑھتی ہے، بہت جلد یہ FRANK ہو جاتی ہے، دوسروں کے ساتھ، اور یہ اس کی بڑی کمزوری ہے، لوگ اس کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں" اور اسے EXPLOIT کرتے ہیں ——"
پرویز اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اوور کوٹ پہن لیا، ہاتھوں میں دستانے لگائے، ٹارچ اٹھائی۔ اور جانے لگا۔
"آپ نلول سے شوق فرمائیے، میں ابھی آیا ——"
"ابھی سے کہاں جا رہے ہو؟"
"میں ایکٹریسوں سے تھوڑی دیر تک گپ شپ کروں گا" اور"
"اور کیا ——؟"
"اور —— مفت کی شراب، قانعی کو بھی نہیں چھوڑنی چاہئے"،
یہ کہکر وہ مسکرایا،
اور دروازہ بند کر کے چلا گیا ——

یہ ایک بڑا کمرہ تھا، ڈاک بنگلے کا ہال، مربع نما، اس کے بیچ میں ایک دروازہ تھا، دروازے کے باہر برآمدہ تھا، ہال کے دو طرف دو کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں، جن کے شیشے لگے ہوئے تھے ہال کے بائیں کونے میں ایک اور دروازہ باتھ روم کو کھلتا تھا، باتھ روم میں فلش لگا ہوا تھا، اور پانی ہر وقت رہتا تھا، ہال کے ساتھ ہی ایک اور چھوٹا کمرہ تھا،

ڈاک بنگلے کا یہ ہال اس جگہ نہیں تھا جہاں ڈاک بنگلہ تھا، اصلی ڈاک بنگلہ جس میں رہنے کے لئے بہت سے کمرے تھے، سڑک کے اوپر پہاڑی کے دامن میں واقع ہے، اور یہ ہال سڑک کے نیچے بنایا گیا ہے بیچ میں سڑک واقع ہے۔

میں جب اس ہال میں داخل ہوا، تو میں لمحہ بھر کے لئے دیکھتا ہی رہ گیا، باہر کی گرد، سرگ آلود اور برفیلی فضاؤں کے مقابلے میں اس ہال کے اندر زندگی ایک اور ہی انداز کے ساتھ جلوہ گر تھی ـــــ دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی میرے نتھنوں کے اندر اسٹوو پر پکتی ہوئی سبزی اور چاول کی بھینی بھینی اور

سوندھی سوندھی خوشبو ٹکرائی، میرے احساس پر گھریلو زندگی کی آسودگی، گرمی اور لطافت کی لہر دوڑ گئی، واقعی ہال میں بڑی گرمی تھی میرے چہرے اور کانوں کو یک گونہ حرارت محسوس ہوئی، اور جب میں نے دوسرا قدم آگے بڑھایا تو ایک جانی پہچانی آواز نے میرا خیر مقدم کیا۔

"آیئے، آیئے رفیق صاحب!" یہ انور صاحب تھے" یہاں تشریف لایئے، میرے بیڈ پر، یہاں آیئے ــــــ دیکھئے آپ آخر کار آہی گئے۔"

"آپ کی محبت کھینچ کر لائی ــــــ" میں نے کہا۔

میں ان کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

انور صاحب سارے جسم کو رضائی سے لپیٹے تکیہ کے سہارے بچھی پر بیٹھے تھے، مفلر انہوں نے سر پر بے ترتیبی سے باندھا تھا، یوں بیٹھے تھے وہ جیسے گھر ہی میں بیٹھے ہوں، وضعداری اور اطمینان سے، انور صاحب نے زندگی کافی دیکھی ہے، زندگی کا سرد گرم چکھا ہے، سفر کی زحمتیں اٹھائی ہیں، اور اب مصائبِ زمانہ نے ان کے ذہن میں اتنی لچک پیدا کر دی ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ حالات سے سمجھوتہ کر کے تلخی کو شیرینی میں بدل سکتے ہیں، ایسا انسان کبھی شکست اور فرار کی باتیں نہیں کرتا ــــــ!

ارے اس ہال میں تو پورا ایک قافلہ پناہ گزیں ہے قسم قسم کے لوگ، بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں ــــــ!

دروازے کے دائیں جانب ایک منجھی بازو کے بل کھڑی کی گئی تھی، جو ایک دیوار کا کام دے رہی تھی، منجھی کے ساتھ ہی ایک سٹوو جل رہا تھا۔ اور اس پر ایک برتن میں سبزی پک رہی تھی، جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی، سٹوو کے سامنے ایک ادھیڑ عمر کی پنڈتانی تھی، سفید ڈوپٹہ اوڑھے ہوئے، ڈھیلا ڈھالا فرن میں ملبوس، وہ سٹوو کے ساتھ الجھی ہوئی تھی اسی کے نزدیک، دیوار کے ذرا قریب ایک بوڑھی عورت تھی، کمر جھکائے، چہرے پر ابھری ہوئی جھریاں لیے کمر کپڑوں کی ایک گٹھڑی بنی ہوئی، جو چاول صاف کر رہی تھی، ایک پانچ یا چھ سالہ بچی منجھی کے ساتھ ہی نہائے گئے، چوکے کو کپڑے سے صاف کر رہی تھی، .... دیوار کے ساتھ دری پر ایک پنڈت جی بیٹھے تھے، جو رہ رہ کر میری طرف دیکھتے، پلکیں زور زور سے جھپکاتے، اور بیزاری سے ساتھ ہی لگی ہوئی منجھی پر بیٹھے ہوئے ایک اور پنڈت جی سے باتیں کرتے ! ——— یہ وہی گھرانا ہے، مجھے فوراً یاد آگیا، میں نے ان کو پہلے بھی دیکھا تھا، منجھی پر بیٹھے ہوئے پنڈت جی بھرے بھرے جسم کے مالک تھے، ان کا چہرہ گول تھا ایک چپاتی کی طرح، اور آنکھوں پر پتلی سی عینک لگی ہوئی، وہ کسی کتاب کے ورق بھی الٹ رہے تھے، اور فرش پر بیٹھے ہوئے پتلے جسم کے پنڈت جی کی باتیں بھی سن رہے تھے، فرش پر بیٹھے ہوئے پنڈت جی کے چہرے کی بیزاری اس وقت گہری ہو گئی، جب انور صاحب نے

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔

" ادھر، یہ منجی خالی پڑی ہے، آپ فوراً چلے آیئے"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔

دروازے کے مقابل، سامنے کی دیوار کے ساتھ تین منجیاں لگی ہوئی تھیں، دو منجیوں پہ بستر رکھے تھے، لیکن ان پر کوئی نہ تھا، اس وقت تیسری منجی پر کوئی انسان رضائی میں منہ چھپائے لیٹا تھا، اور جونہی میں نے انور صاحب سے کہا ـــــ " شکریہ، میں ابھی بستر اور سوٹ کیس لاؤں گا ـــــ " تو رضائی میں سونے والے نے حرکت کی۔ میری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی، رضائی چہرے سے ہٹ گئی، اور وہاں ایک عورت کا چہرہ نمایاں ہو گیا ـــــ چاند کی طرح روشن لیکن زردی مائل، ـــــ دو چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں، ہرنوں کی معصومیت اور حیرت لئے ہوئے، میری طرف گھورنے لگی۔

بھلا یہ چاند سی عورت ـــــ ؟

میرے تعجب کو کسی نے بھی بھانپ نہیں لیا۔

اچانک انور صاحب کے ساتھ منجی پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے بڑی شفقت سے اس سے پوچھا۔

" کیسی طبیعت ہے اب؟ خوب نیند کر لی۔ کیوں، اب تھکاوٹ کچھ کم ہوئی ـــــ ؟

اچھا میاں تو تم یہاں براجمان ہو ——— تم ہی تیلی سی آواز والے ڈرائی کلینر ہو نا، اسمال جواب تم سبھوں کو میں نے ڈھونڈ نکالا بھلا تم چھپ کر کہاں رہتے ہو؟ میرے دل سے آواز آرہی تھی، وہ سوال پر سوال کر رہا تھا۔ لیکن وہ لیٹی ہوئی مہ جبین خاموش تھی، اس کے ہونٹ سئے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر زردی تھی، اور زردی میں ڈوبی ہوئی مدھم سی آنچ سلگ رہی تھی — اس کی آنکھوں میں ہرنوں کی معصومیت اور حیرت نے میرے خیالوں میں خلفشار پیدا کیا، میں حیران تھا یہ عورت کون ہے؟ یہ ماجرا کیا ہے؟

یہ انور صاحب بھی بڑے چغد نکلے، میری حیرت کو سمجھتے نہیں، اور یہاں کے لوگوں سے میرا تعارف نہیں کراتے! ——— مجھے اس چھوٹی سی دنیا کے لوگ عجیب نظر آرہے تھے، پر اسرار کھوئے کھوئے سے، حیران حیران سے لیکن مطمئن ایک دوسرے کے شناسا ایک دوسرے کے ہمراز، اور انور صاحب بے تکلفی اور روانی سے بولتے چلے جا رہے تھے۔

"رات بھر برف گرتی رہی، ماشاءاللہ اتنی برف، میں سمجھا شاید ہمیں برف ہی میں دب جانا ہے۔ صبح جب میں نیند سے جاگا، میں عموماً صبح سویرے اٹھتا ہوں، نماز فجر کے وقت، پرانی عادت ہے میری، والد صاحب بھی جب تک رہے، ہمیشہ مرغ کی آواز سنتے

ہی فوراً اٹھنے، یہ عادت ہمیں وراثت میں ملی ہے۔ آج صبح سب سے پہلے میں نے آسمان کی طرف دیکھا، کچھ نظر نہ آیا۔ سیاہ دھند پھیلی تھی ذرا آگے گیا برآمدے پر —— تو صاحب اتنی برف، اتنی برف کہ کچھ نہ پوچھیے ——

"اور بعد میں جب میں کمرے سے نکلا تو اس وقت بھی برف کے گالے گر رہے تھے"

مچھی پر بیٹھے ہوئے پنڈت جی نے کتاب سے نظریں اٹھا کر کہا

"آج رات سردی بھی سخت لگی ——" فرش پر بیٹھے ہوئے پنڈت جی بولے، وہ لمبے چوڑے فرن میں ملبوس تھے، ان کے سر پر پگڑی تھی،

"سخت سردی پڑی، میری تو ڈر کے مارے جان نکلی ——" چاول صاف کرتے ہوئے بوڑھی پنڈتانی پوپلے منہ سے رک رک کر بولی۔

"کیوں دادی؟" بچی اس کے منہ کو تکنے لگی حیرت کی تصویر بن کر۔

"مجھے وہم ہوا جیسے میرا جسم بے حس ہو گیا ہے ——"

"سچ ہے، انسان کا کیا بھروسہ، انور صاحب نے بے تکلفی سے کہا،

"بزرگوں نے کہا ہے، انسان پتھر سے زیادہ سخت ہے، اور پھول سے زیادہ نازک ——"

"بالکل سچ ہے، بالکل سچ ——"

"یہ بھگوان بھی کسی سے بڑا کٹھور بنتا ہے ——" ادھیڑ عمر کی عورت بولی،

"منش کو مصیبت میں چھوڑتا ہے، اور خود لیکن، ایسی بات نہ کرو ——" فرش پر بیٹھا ہوا نپڈت جو بار بار آنکھیں جھپکاتا ہے یہ سنکر بے چین ہوا۔

"منش ہی کے لئے یہ سب کٹھنائیاں ہیں ——"

"سچ تو یہ ہے، سمسار چند جی، انسان صبر نہ کرے تو کیا کرے، انسان کو ہمت سے مشکلوں سے ٹکرانا چاہئے،" انور صاحب نے اپنے فلسفۂ حیات کی گرہ کھولی۔

یہ لوگ باتیں کرتے رہے، دنیا کے دکھ سکھ کے مسائل پر اظہار خیال کرتے رہے، مجھے محسوس ہوا، جیسے یہ چھوٹی سی دنیا میری اپنی دنیا ہے۔ جانی پہچانی دنیا —— یہاں دکھ کی باتیں ہیں، درد و غم کے افسانے ہیں، چہروں پر بیزاری کی لکیریں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں، مسرتیں ہیں، شکایتیں ہیں، یہاں زندگی پر تنقید ہوتی ہے۔ تبصرے ہوتے ہیں، اس دنیا کی ہر ادا مجھے پیاری ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ رفتہ رفتہ میرا وجود ان سبھوں

کے لیے اجنبی نہ رہا۔ میرے آتے ہی پنڈت سمسار چند کے چہرے پر جو بیزاری اور اکتاہٹ آگئی تھی، وہ کافور ہوگئی تھی۔ عورتیں بھی اب مجھے اسی ایک کنبے کا ایک فرد سا محسوس کرنے لگیں اور جب میں نے موقع پاکر گفتگو کا رخ اپنی سمت موڑ دیا۔ اور بڑی راست بازی سے بیان کیا۔ کہ یہ تین دن میں نے کس حال میں گذارے کہاں گذارے، اور کیونکر گذارے، تو قریب قریب سبھوں نے اظہار تاسف کیا۔ اور سبھوں کے چہروں پر ہمدردی اور مہربانی کی چمک آگئی۔

"آپ پہلے ہی دن آئے ہوتے، یہاں تو دو منجیاں خالی پڑی تھیں ——" سمسار چند نے ہمدردی سے کہا۔

"بھائی صاحب، یہ سفر کا معاملہ ہے، چند روز ساتھ گذاریں گے پھر نہ جانے زندگی ہم سبھوں کو کہاں اور کس طرف لے جائے گی ——"

"اور کیا ——" انور صاحب کہاں خاموش رہنے، میں نے تو پہلے ہی دن رفیق صاحب سے کہا تھا ——"

اتنے میں دروازہ کھلا، اور ایک دبلا پتلا نوجوان سیاہ چمڑے کی ٹوپی پہنے، سیاہ چادر اوڑھے اندر آیا۔

وہ خاموشی سے، سر جھکائے اندر آنے لگا۔ اور میری نگاہیں بے چینی سے اس کا تعاقب کرنے لگیں۔

"کہو، غلام محمد، برف گر رہی ہے کہ ——"

"گر تو رہی ہے، لیکن کم کم ——"

یہ نوجوان اسی بیڈ پر آیا، جس پر وہ چاند جیسی عورت محوِ استراحت تھی، وہ آیا اور ٹانگیں لٹکائے ہوئے اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اور اس نے اپنے ہاتھ سے اس کا ڈوپٹہ ٹھیک کیا۔ اس کے سرسری ماتھے پر الجھے ہوئے زلف سنوارے اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"تم اب بالکل اچھی ہو —— ہو نا؟ بخار تو کچھ بھی نہیں۔"

وہ پیار سے بولا، مسکراتے ہوئے!

وہ اسے دیکھتی رہی، اس کی آنکھوں کو دیکھ کر آہوئے رم خوردہ کی یاد آتی تھی!

"اسے صرف آرام کرتے دیجئے، یہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گی ——" سمار چند نے مشورہ دیا۔ اور فرشی حقے کی نَے منہ میں داب لی، اور آنکھیں جھپکانے لگے۔

"کیا یہ خدانخواستہ بیمار تھیں؟" میں پوچھنا چاہتا تھا، لیکن کس سے پوچھوں؟ میں خاموش رہا، میرے ہونٹ بیچینی سے تھرتھراتے رہے، ہائے وہ لمحے جب انسان کی روح بیساختہ پکار اٹھتی ہے، لیکن ہونٹوں پر مہر لگتی ہے —— ابھی اجنبیت کے تمام پردے نہیں اٹھے تھے، کچھ پردے اور اٹھنا باقی

تھے، پہلے میں یہاں آکر قدم تو جمالوں، پھر سارے اسرار کھل جائیں گے، ——

دیر کاہے کی —— کارِ خیر میں دیر کرنا حماقت ہے، میں نے دل ہی دل میں سوچا، اور انور صاحب سے یہ کہہ کر ہال سے نکلا۔

"اچھا حضرت، تو میں پہلے اپنا سامان لے آؤں، پھر خوب باتیں ہوں گی ——"

●

تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی،

دین محمد کی دکان میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے میں نے اپنی کانگڑی میں تھوڑی سی آگ ڈلوائی، آگ دین محمد نے خود ڈالی، حالانکہ اس کے تنے ہوئے اور خشونت بھرے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے یہ بات پسند نہیں۔ لیکن میں روز ہی خالی کانگڑی چولھے کے سامنے رکھتا، اور دین محمد کے یہ جملے کہ خشک لکڑی ملتی نہیں، ادھر سے برف نے ستیاناس کر دیا۔ وغیرہ کو میں یہ کہکر ٹال دیتا کہ آج غضب کی سردی پڑ رہی ہے، دراصل دین محمد کی جھنجھلاہٹ بھی بے وجہ نہ تھی، دن میں بار بار لوگ خالی کانگڑی لے کر چلے آتے اور وہ صاف انکار بھی نہ کر سکتا تھا کیونکہ یہ لوگ اس کی دکان سے کھاتے تھے،

کانگڑی پیٹ میں دبا کر میں دکان کے اندرونی حصہ میں آیا، آج دکان کے عقبی حصہ سے بینچ اور ٹیبل ہٹا دیا گیا تھا، اور وہاں ایک پرانی سی چٹائی بچھی تھی، چٹائی پر دو دیہاتی بیٹھے تھے، ایک وضع قطع سے ذیلدار جیسا لگ رہا تھا، اور دوسرا معمولی

"میاں خلیل کوئی دوا کھالی ؟"

"دوا کیا کرے گی ؟ تلخ جائے ہو لنگا ـــــــ" میاں خلیل بولے ہم لوگ یہاں برے پھنسے، بڑی مصیبت میں گھر گئے ہم، ادھر سے یہ برف رکتی نہیں، شاہ صاحب ـــــــ"

"میں نے کہا، شاہ صاحب حکم دیں، تو برف فوراً رک جائے گی، اور ـــــ اور دھوپ نکلے گی، دھوپ ـــــ" دین محمد چولہے کی آگ میں خشک لکڑی ڈالتے ہوئے بولا، بڑی سنجیدگی کے ساتھ۔

خواجہ صاحب ایک نظر شاہ صاحب ڈالتے رہے۔ اور دوسری نظر دین محمد پر۔ انہیں دین محمد کی باتوں سے الجھن ہو رہی تھی،

ذیلدار نے نفرت سے دین محمد کو دیکھا۔

ساتھ بیٹھے ہوئے دیہاتی نے زور زور سے شاہ صاحب کی ٹانگوں کو دبانا شروع کیا۔

اور دکان میں کام کرتے ہوئے دیہاتی لڑکے نے میرے لئے دو روٹیاں لائیں، اور سبزی کا آدھا پلیٹ۔

شاہ صاحب بڑبڑا رہے تھے،

"یہ پہاڑ چیختے ہیں، رات آچکی ہے، وہ ـــــ وہ دور کھیت پر بجلی گر پڑی، دس ٹبرے اور دس گائیں سیلاب میں ڈوب گئیں۔ دکان کی چھت پر ایک کالی کلوٹی ڈبی چکر کاٹ رہی ہے" ـــــ ہاہاہا ـــــ ہی ہی ہی ـــــ"

اس کی باتیں بڑی ڈراونی تھیں، خوفناک ـــــ بے ترتیب"

"سنو ـــــ" میں نے دیہاتی لڑکے سے کہا

"جی ـــــ"

"یہ آدمی ہے کون"۔ میں نے سرگوشی کی۔

"یہ درویش ہے، درویش، خدادوست ـــــ کہتے ہیں، پہاڑوں سے اترا ہے۔ جنگل میں اس کا ٹھکانہ ہے، سویرے ایک گوجر کہتا تھا کہ یہ پہنچا ہوا قلندر ہے ـــــ"

میں چوکیدار کے پیچھے جو میرا بستر اٹھائے ہوئے تھا کمرے سے نکلا میرے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا، ہم برآمدے پر چند قدم ہی چلے تھے کہ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا، اور وہاں سے وہی انجنیئر نکلا، جو ایک دن گردن اکڑا کے ہمارے قریب سے گذرا تھا،

وہ ہمیں سامنے دیکھ کر ٹھٹھکا۔

اور دوسرے لمحے دروازے سے کماری نکلی،

میں نظریں جھکائے چلنے لگا، لیکن کماری نے مجھے آواز دی۔

"آپ کہاں بستر گول کر چکے ہیں؟"

"میں —— میں نیچے ہال میں جا رہا ہوں، وہاں میرے ایک دوست بھی ٹھہرے ہیں"

"بھئی یہاں ہم آپ کے دشمن تھوڑے تھے ——"

وہ مسرور تھی، اور ایک مسرور پرندے کی طرح چہک رہی تھی، اور میری حیرت نگاہیں اس کے جسم سے پھسل پھسل رہی تھیں، اس کے بال آوارہ تھے، الجھے الجھے، پریشان

اس کی ساڑھی پر جگہ جگہ شکنیں پڑ گئی تھیں، اس کے چہرے پر شفق کی لالی کھلی ہوئی تھی، اور اس کی پلکوں کے دراز کانپتے ہوئے خوابناک سائے جادو کی کیفیت میں رچے ہوئے تھے۔

"اچھا تو یہی رفیق صاحب ہیں، جن کا ذکر آپ نے کیا تھا۔" انجنیئر بولا، نشہ آور آواز میں، میں نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی، فراخ بھرا بھرا چہرہ، آسودہ حالی کا غماز، آنکھوں میں نشہ کی لہریں تیرتی ہوئی! وہ سچ مچ شراب کے نشے میں چور تھا۔

"جی ہاں، ہمارے ہم سفر ہیں ـــــ لکھنؤ سے ایم۔اے کر کے آئے ہیں۔ ـــــ"

VERY GLAD TO SEE YOU ـــــ" انجنیئر نے تپاک سے ہاتھ ملایا۔

"THANK YOU ـــــ آپ ـــــ؟"

"آپ انھیں نہیں جانتے؟" کماری بیچ میں بولی، "یہی اختر صاحب ہیں، انجنیئر ہیں آپ، اور ہمیں فخر ہے کہ ہمارے فیلو کلاس رہے ہیں۔"

THANK YOU FOR THIS COMPLIMENT" انجنیئر کی آواز لرز رہی تھی، اور میں حیرت سامان کماری کی شخصیت کے اس نئے رخ کو دیکھ رہا تھا۔ کتنی نئی تہیں کھل رہی تھیں!

اور جب میں یہ وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا کہ میں کل ضرور

ملنے آؤں گا۔ نو کماری نے ایک شیریں تبسم کے ساتھ انجیز اور مجھے، دونوں کو الوداع کہی اور رقص کی ایک ادا کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ انجینیر نے ایک معنی خیز نگاہ مجھ پر ڈالی، اور لڑکھڑاتے ہوئے برآمدے پر چلنے لگا۔

برفیلی ہوا کے جھکّڑ چل رہے تھے،

میرے قدموں کے نیچے برف کی دبیز تہیں چرچرا رہی تھیں اگر میں ڈاک بنگلہ کا یہ کمرہ نہ چھوڑتا، تو بہت جلد اس کا فراد اعورت کے التفات کی بارش مجھ پر ہوتی! ــــــ

کتنی فیاض ہے یہ!

لیکن ــــــ؟

یہ عورت میری روح کی پوشیدہ گہرائیوں میں کیسے اتر سکتی ہے، روح کی ان مقدس گہرائیوں میں حور کی ایک خوبصورت بیٹی پہلے ہی براجمان ہے ــــــ!

میں نے جب ہال میں داخل ہو کر اپنی منجیا پر بستر بچھا دیا تو مجھے احساس ہوا کہ موسمی حالات بد سے بدتر ہونے پر بھی میں مر نہیں جاؤں گا اس ماحول میں جہاں باہمی برادری، یگانگت اور یک جہتی کا احساس ہو، جہاں مذہب اور رنگ و نسل کی دیواریں ڈھہ چکی ہوں، جہاں انسان انسان کی مجبوریوں اور تلخیوں کو محسوس کرتا ہو۔ جہاں دل کی محرابوں پر پیار کے چراغ جلتے ہوں۔ ــــ وہاں

کوئی ننھے سے ننھا انسان بھی موت سے خائف نہیں ہو سکتا، انتہائی مایوس کن حالات میں بھی انسان حیات، روشنی اور محبت کی تلاش کرتا ہے، یہ تلاش زندگی ہے ——— زندگی کی تلاش!

میں بستر میں داخل ہوا،

ہال کی پختہ دیواروں پر سفیدی کی ہوئی تھی، اور چھت نوبر کی لکڑی کی بنی ہوئی تھی،

میں شام ڈھلے تک بستر میں بیٹھا رہا، سوتا رہا، جاگتا رہا، اونگھتا رہا، باتیں سنتا رہا، اور باتیں کرتا رہا،

سب سے پہلے میں نے اس خوبصورت عورت کی جو کہ بستر میں لیٹی تھی، اور اس کے خاوند کی کہانی سنی، یہی وہ جوڑی تھی، جو تیسرے روز صبح سویرے پیدل اور آدھے ہول کے ساتھ پیدل جموں جانے کے لئے روانہ ہوئے تھے، وہی لوگ جن کے بارے میں پرویز نے بتایا تھا، اور اسی دن شام ڈھلے یہ دونوں میاں بیوی ہال میں آئے تھے،

دونوں تھک کر چور ہو گئے تھے، دونوں نڈھال تھے، عورت کی حالت تو ناگفتہ بہ تھی، برف میں چلتے چلتے اس کے پاؤں اور اس کی ٹانگیں سن ہو کر رہ گئی تھیں، اور وہ خاوند کے سہارے اپنے جسم کو گھسیٹ رہی تھی، ہال میں داخل ہو کر ہی وہ منجی پر گر پڑی، اور بے ہوش ہو گئی،

اس کا خاوند الگ نڈھال ہو چکا تھا، وہ خود ایک منجی پر گر پڑا، اور اس نے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو گڑگڑا کر مدد کے لئے پکارا

لمحہ بھر تک سب لوگ حیرت سے یہ نظارہ دیکھتے رہے اور پھر فوراً پنڈت جی جو سی آئی ڈی تھے نے انکشاف کیا کہ یہ لوگ صبح ڈاک بنگلہ سے پیدل روانہ ہوئے تھے، ٹینی تاپ تک، اور اب واپس لوٹ آئے ہیں، شاید برف کی شدت نے انھیں آگے جانے سے روک دیا ہے اور یہ تھک ہار کر واپس لوٹے ہمیں اتنا سنا تھا کہ سب لوگ حرکت میں آ گئے، انور صاحب نے فوراً اپنی کانگڑی پیش کی۔ پنڈتانیوں نے سٹوو پر پانی گرم کیا۔ اور پھر رات گئے تک وہ سب ان مصیبت زدوں کی مدد کرتے رہے، عورت مشکل سے ہوش میں آئی۔ اگر اسے فوراً گرمی نہ پہنچائی جاتی اس کے سارے جسم پر فالج گرنے کا خطرہ تھا، اور صبح کو اس کے خاوند جس کا نام غلام محمد ہے نے انھیں بتایا کہ وہ شدید برف میں چلتے رہے۔ وہ برابر آٹھ میل تک چلتے رہے لیکن اس کے بعد اس کی بیوی کی ہمت جواب دینے لگی، اس کے پاؤں اب برف میں اٹھ نہیں رہے تھے، خود اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے، سرد ہوا کے جھونکوں سے ان کی جان نکلنے لگی، اتنا ہی نہیں قدم قدم پر اتنی گاڑھی اور دبیز دھند پھیل جاتی کہ وہ دوسرے انسان کو کیا۔ اپنے ہاتھ پاؤں بھی دیکھ نہ سکتے تھے، ادھر سے برف کا بوجھ تھا کہ ان کے جسموں پر برابر بھاری ہوتا جا رہا تھا، آخر ایک جگہ اس کی بیوی چکرا کر گر پڑی اس نے لاکھ کہا کہ اب صرف ٹاپ تک ہی چلنا ہے، اور وہیں تک برف ہے، اب چند میل رہ گئے ہیں۔ لیکن

وہ منہ کھولے، بے حس، پتھریلی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی ــــــــ
ناچار اسے آگے جانے کا ارادہ ترک کرنا پڑا، اور وہ دونوں واپس
چلے آئے، دوسرے لوگ پہاڑ پر چڑھ گئے، انہوں نے سمجھا کہ واپس
مڑنا خطرے سے خالی نہیں اور خود اسے بھی اس کا احساس تھا، لیکن
وہ مجبور تھا، ــــــــ اور پھر جس حالت میں وہ واپس اترے، وہ
بیان نہیں ہو سکتی۔ اگر اللہ نے ابھی ان کی تقدیر میں روزی نہ
لکھی ہوتی تو وہ یقیناً راستے میں ہی مر گئے ہوتے، اور ان کے مردہ
جسم برف کی قبر میں دب گئے ہوتے!

سمبار چند، انور صاحب اور خود غلام محمد نے میرے لئے اس
دلگداز کہانی کے تانے بانے جوڑ دیئے، غلام محمد کی بیوی گہری نیند
سو رہی تھی، اور منجھی پر بیٹھے ہوئے پنڈت جی آنند جو کوئی
مذہبی کتاب پڑھ رہے تھے، اور بوڑھی پنڈتانی بار بار کانگڑی کے
بجھتے ہوئے کوئلوں کو پھونکتی تو چھوٹی بچی جس کا نام آشا تھا، فوراً
اس کے جھریوں والے ہاتھ سے کانگڑی لے لیتی، اور خود کانگڑی
کو چھوٹی چھوٹی پھونکیں مارتی، ادھیڑ عمر کی عورت اونگھ رہی تھی،
ان کے بنائے گئے چوکے میں چند برتن قرینے سے رکھے گئے تھے، اور
بستر کو سمیٹ کر دیوار کے ساتھ رکھا گیا تھا،

آنند جو کے ساتھ ہی کچھ فاصلے پر، دروازے کے مقابل میں
بڑ منجھی لگی ہوئی تھی، اس پر اپنے پرانے جان پہچان کے پنڈت جی

کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی، وہ بھی مجھے وہاں دیکھ کر مسرور ہوئے
ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ سی، آئی، ڈی میں، اور جموں سے
ٹرانسفر ہو کر سرینگر جا رہے ہیں، ان کا نام کول صاحب ہے اور
سب ان کا پورا نام جاننے کی بجائے کول صاحب ہی سے کام چلاتے
ہیں. کول صاحب دبلے پتلے آدمی ہیں، کلین شیو چہرے پر زمانے کے
نشیب و فراز کے آثار، بڑی بڑی آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی، سر پر
ہلکے نیلے رنگ کی پگڑی ــــ کول صاحب جہاں سرکار کے سی آئی
ڈی تھے، وہاں وہ ہال میں مقیم لوگوں کے قافلے کے لئے بھی سی آئی
ڈی، کا کام کرتے ــــ ہال سے صبح نکل جاتے اور شام سے پہلے
آجاتے، اس پہاڑی علاقے میں شدید برف باری میں گھومتے، ملٹری
آفیسروں سے ملتے، پی، ڈبلو، ڈی والوں سے راستے کے تازہ حالات
معلوم کرتے، ڈاک بنگلے کے دلچسپ اور سنسنی خیز واقعات کی خبر لاتے
شام کے وقت سب ہی ان کے منتظر رہتے، باہر
کے حالات جاننے کے منتظر! اور پھر کول صاحب آتے، خاموشی سے، اور
دیر تک مدھم لہجے میں دلچسپ تازہ خبریں سنایا کرتے،

آنندہ جو بھی دلچسپ آدمی ہیں، سرینگر سے دور
پچاس میل کے فاصلے پر ایک قصبے میں پوسٹ ماسٹر کے عہدے پر
فائز ہیں، ان کی ایک ہی لڑکی ہے، جو بیاہی گئی ہے، ان کی بیوی آج
سے گیارہ سال پہلے سرگباش ہوئی ہے، لیکن انہوں نے دوسری

شادی نہیں کی، صرف اپنی شریمتی کی پیاری یادگار روپا کو خون جگر سے پروان چڑھاتے رہے۔ اسے تعلیم دلائی، میٹرک کرایا، اور ایک سرکاری ملازم سے اس کی شادی کرائی۔ اور خود آنند صاحب گھر میں تنہا رہے تنہا، تنہا، بیوی کی موت کے بعد وہ دنیا کی رنگینیوں اور دلچسپیوں سے بیزار ہو گئے، انھیں دنیا کی بے ثباتی سے دل ڈرنے لگا، اور وہ مذہبی کتابوں کے مطالعے میں ذہنی اور روحانی سہارا ڈھونڈنے لگے ـــــ"

مجھے آنند جو کی بے کیف اور تلخ زندگی سے ہمدردی پیدا ہونے لگی۔

اور یہ جو سمار چند ہیں، بار بار اور زور زور سے آنکھیں جھپکانے والے دھارمک انسان، آنند جو کے قصبہ میں پنساری کی دکان کرتے ہیں، اپنی ادھیڑ عمر بیوی، اور پوتی آشا اور بوڑھی ماتاجی کے ساتھ تھے، یہاں بھی وہی کھانا پکانے کا انتظام کرتے تھے، آنند جو کو وہ جانتے تھے، اور وہ بھی ان کے ہی ساتھ کھاتے پیتے تھے، لیکن کول صاحب باہر دکان پر کھاتے تھے،

اور غلام محمد نے مجھے بتایا کہ اس کے بھائی صاحب جموں میں ہیں، وہ ایک ہوٹل کے مالک ہیں، وہاں ان کا اہل وعیال بھی ہے۔ اب وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں ان کے اصرار پر وہ اپنی بیوی کے ساتھ وہاں گیا تھا، اور وہاں ایک مہینے تک رہا لیکن گھر سے اچانک تار ملنے

پر وہ دونوں سرینگر جا رہے تھے، ورنہ وہ وہاں بڑے میں تھے غلام محمد سرینگر میں لکڑی کے ٹھیکہ کا کام کرتا ہے، غلام محمد کی ایک بات سے میں خاص طور پر متاثر ہوا، وہ یہ کہ وہ اپنی نوعمر بیوی کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا، بار بار اس کی طبیعت کا حال پوچھتا، بار بار اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتا، بار بار اسے گرم پانی پینے کے لئے کہتا۔

بار بار اس کی نبض محسوس کرتا، اس کے جسم پر رضائی اچھی طرح لپیٹ کے رکھتا، اس کے چہرے پر جھک جاتا اتنے لوگوں کی موجودگی اسے کسی رکاوٹ کا باعث نہیں تھی، جیسے یہ سب لوگ ایک ہی گھر کے افراد تھے، اس کے اپنے گھر کے افراد ـــ اور مجھے یہ بات بہت پسند آئی ـــ

اور ڈرائی کلینر اسمال جو کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ ایک اور آدمی کے ہمراہ جموں گیا ہوا تھا، یہ دیکھنے کیلئے کہ سردیوں میں جموں میں ایک ڈرائی کلین کی دکان کھولنے کے کیا امکانات تھے، وہ ہفتہ بھر وہاں ٹھہرا تھا، اور اب واپس گھر لوٹ رہا تھا، کیونکہ اپنی پیدائش جگہ سے دور، اپنے گھر سے دور، اپنے عزیز بچوں سے دور، اپنے عزیزوں سے دور، زندگی ویران سی تھی ـــــ اس کا خیال تھا، زندگی میں صرف روپیہ ہی سب کچھ نہیں اپنے گھر کا سکھ اور راحت بڑی چیز ہے ـــ دن بھر محنت کرو، خون پسینہ ایک کرو، ایمانداری سے کماؤ، عزت سے کھاؤ، اور اپنی بیوی بچوں میں رہو ـــــ یہی

بڑی دولت ہے۔ بڑا سرمایہ! اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے؟
اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے اس مختصر سی زندگی کے لئے!——
مجھے اسماعیل جوڑدانی کلینز کی ان باتوں میں ایک عظیم اور معنی خیز فلسفہ
حیات کی بو آئی —— یہ لمبا دھڑنگا انسان، خاموش رہنے والا
انسان جس کے چہرے پر افسردگی اور یتیمی کے آثار لئے ہوئے یہ انسان،
اور بہت ہی باریک اور گھٹی گھٹی آواز میں باتیں کرنے والا انسان
زندگی کے اصلی حسن کے راز کو پا چکا تھا —— مجھے اس سے پہلے
جو نفرت سی پیدا ہوئی تھی، صرف اس کی نسوانی آواز سن کر وہ
یکلخت دور ہو گئی —— دراصل انسان کو دور سے ہی دیکھ
کر اس کے کردار کے بارے میں یک طرفہ رائے قائم کرنا انصاف سے
بعید ہے —— انسان قریب آتا ہے، شخصیت کی تہہ در تہہ
گرہیں کھلتی ہیں، نئے اسرار بے نقاب ہوتے ہیں، نئی حقیقتیں جگمگاتی
ہیں —— اور انسان پر پیار آتا ہے!
اور انور صاحب —— انور صاحب تو میر مجلس تھے!

Dated 18-4-1985

•

"بھئی، میرا خیال ہے یہ ایکٹریسیں نہیں ہیں، ہاں ایکسٹرا گرلز ہونگی ——"

انجینیر اختر کہہ رہا تھا، اس کے کمرے میں خوبصورت سامان لگا تھا، ایک قیمتی بیڈ پر خوبصورت بستر، ٹیبل پر شیونگ سیٹ بے ترتیبی کی حالت میں، اور دو وہسکی کی بوتلیں سربند، اور بھی کچھ بوتلیں اوندھے منہ پڑی تھیں، خالی بوتلیں، جو دروازے کی بائیں جانب دیوار کے ساتھ پڑی تھیں،

"کل سے تو ان کی حالت خراب ہے —— ہاہاہا —— اختر ہنس پڑا۔

"کیا ہوا ان کو ؟ ——"

"بھئی کچھ نہ پوچھو —— ایک دن تو یہ لوگ اپنے ساتھ لائی ہوئی شراب پر زندہ رہے۔ دوسرے دن یہاں سے دوگنی تگنی قیمت دے کر معمولی سے معمولی شراب بھی حاصل کی، وہسکی، رم، جن، اور پھر ٹھرا بھی یوں پیتے رہے، جیسے بڑی نعمت ہے۔ اس کے بعد دو دن کینٹین سے کچھ بوتلیں ملیں، لیکن اس کے بعد ان کی حالت چوپٹ ایک ایکٹریس اب بھی بستر کے ساتھ لگی ہوئی ہے وہی جو بہت young نظر آتی ہے، اور وہ شراب کے بغیر سانس بھی نہیں لے

سکتی ـــــ ادھر جو سب سے خوبصورت لڑکی ہے، کیا نام ہے اس کا نالتی وہ نازک سی لڑکی، جو تھرکتی رہتی ہے ـــــ وہ تو سالی خود شراب کی ایک بوتل ہے WONDRFUL" کل مجھ سے برآمدے پر ملی، اور خوب چہکتی رہی ـــــ پھر میری دعوت پر آئی شام کو میرے کمرے میں ـــــ سالی چند پیگ چڑھا کر ہی فلیٹ ہو گئی، اور میرے بیڈ پر دراز ہو گئی، رات بھر یہیں پڑی رہی، ـــــ"

اختر نے گویا فلیک سگریٹ کا لمبا کش لے لیا!

" ان تینوں میں بس ایک WONDERFUL PIECE تھا ہے۔ دو اور جو ہیں، وہ تو بس یونہی سی ہیں! ایک تو اب بھی بیمار سی نظر آتی ہے دوسری جو ہے وہ تو بالکل ہڈی ہے ـــــ

اختر روانی اور بے تکلفی سے ان ایکٹریسوں پر اپنی بے لاگ تقریر کر رہا تھا، اور میرے ذہن میں کئی سوچیں پر پھڑپھڑا رہی تھیں،

" یہ لوگ یہاں بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں ـــــ"

" اور کیا ـــــ؟"

" شوٹنگ کرنے کیا آئے، ان کا تو سب کچھ گیا ـــــ"

" شوٹنگ! ـــــ ہو! ارے واہ، آپ بھی، اس غلط فہمی کے شکار ہیں، WONDERFUL ـــــ"

" تو پھر کیا ـــــ؟"

" بھئی شوٹنگ یہ سالیاں خاک کریں گی، ـــــ اس کے لئے

تو پورا لاؤ لشکر ساتھ ہوتا ہے۔

بمبئی میں، میں نے دوبار لیک پر دیکھا ہے فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی، ایک تماشا کا سا کام تھا، لیکن ساز و سامان اور اہتمام اتنا تھا

اتنے میں دروازے پر آہٹ ہوئی

"میں اندر آ سکتی ہوں ___ ؟"

دروازے پر کماری مسکراہٹ کی قوس قزح بکھیرتی ہوئی کھڑی تھی، وہ چست قمیص اور شلوار میں ملبوس تھی، اور اس کے شانوں پر گرم شال تھا۔ کام کیا ہوا سیاہ رنگ کا خوبصورت ملائم شال!

"آئیے کماری جی ___ آج صبح سے آپ کی صورت دیکھنے کو ترستے رہے ___"

اختر نے بڑی گرمجوشی سے کہا۔

مجھے اس ماحول میں اب کوئی اجنبیت یا دوری کا احساس نہ رہا تھا، میں ان دونوں کی باتیں سنتا رہا خود بھی کبھی کبھی بات کرتا رہا۔ ہوں ہاں کرتا رہا۔ اور یہ سب کچھ یوں ہوتا رہا۔ جیسے عام روزمرہ زندگی میں اختر اور کماری جیسے کردار ملتے ہیں بڑی آسانی کے ساتھ!....

یا اللہ! یہ کیسی دنیا میں آ گیا تھا میں جہاں ایک خوبصورت عورت اتنی بے باکی اور سپردگی کے انداز میں غیر مردوں سے ملتی ہے اور کسی کو حیرت نہیں ہوتی ___ !

"ڈی، آئی، پہلے وہ کہتے رہے ابھی راستہ کھلنے کا کوئی امکان

نہیں، ادھر سے ایک نئی ٹریجڈی ہوئی ہے ــــــــ" کماری کے لہجے میں اندر سے پھوٹتے ہوئے نغموں کی نرمی تھی، اور رس تھا!!

"کیا ــــــ؟" میں نے کہا۔

"لیکن آپ پہلے تشریف تو رکھئے ــــــــ" اختر نے کماری سے کہا۔

"بھئی کہاں بیٹھیں گے ہم ــــــ؟ یہاں تو آپ نے کوئی کرسی بھی نہیں رکھی ہے ــــــــ"

"ایک تو رکھی ہے ــــــ"

"اسے آپ کے دوست پہلے ہی occupy کر چکے ہیں ــــ"

"آپ یہاں بیٹھئے میں ــــــ میں ــــــ" میں شرمندہ ہو گیا

"آپ بیٹھئے، میں یہاں بیٹھوں گی ــــــ"

اور وہ اختر کے خوبصورت بیڈ پر بیٹھی، اور اس نے ساٹن کی شلوار میں چھپی ہوئی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ دی، اس کی شلوار کا تنگ پائنچا ٹخنوں سے اوپر ڈھلک آیا۔ نیلون چپل میں اس کے چھوٹے چھوٹے دودھیا رنگ کے پاؤں بہت خوبصورت لگ رہے تھے،

"اچھا تو کیا ٹریجڈی ہوئی ہے ــــ" اختر کی سانسیں الجھ رہی تھیں!!

"ہوا یہ ہے کہ جموں کا راستہ بھی بند ہو گیا ہے ــــ"

"یہ تو بھئی پرانی خبر ہے ــــــ"

"میں نے تو آج ہی سنی، اب تو ہم پھنس گئے ــــــ"

"جب پھنس گئے، تو تڑپنا کیا ــــــ ویسے یہ ایڈونچر بھی یادگار رہے گا ــــــ WONDERFUL

"آپ تو WONDERFUL بتا رہے ہیں، سچی بات یہ ہے کہ اب طبیعت گھبرائی ہے۔"

"آپ درست کہہ رہی ہیں ــــــ" مجھے اپنی طویل خاموشی کھٹکی ــــــ "کچھ لوگوں کی حالت تو بہت خراب ہو گئی ہے۔ بیچاروں کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں، اور ادھر سے دکان دار انھیں دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں ــــــ"

"میں نے کہا، زیادہ دن لگے، تو اپنا بھی یہی حال ہو گا، کماری جی کے لہجے میں افسردگی کی لرزش تھی، گھر سے نکلتے وقت خبر ہوتی، تو زیادہ پیسہ ساتھ لے آتے ــــــ"

کماری جی کی بات نے میرے خیالات کو لرزہ براندام کر دیا، میری حالت پہلے ہی پتلی ہو چکی تھی، اور اب میں صرف دو وقت چند آلوؤں کی روٹی اور سبزی پر گزارہ کرتا۔ دو روز سے میں نے چائے کی شکل بھی نہ دیکھی تھی، ادھر ہال میں شفٹ ہونے سے دو روپیہ کے بجائے اب صرف چوبیس گھنٹے کے آٹھ آنے کرایہ دینا تھا، ابھی تک تو میری ساکھ قائم تھی، لیکن آگے کیا حال ہو گا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اختر تو ان باتوں سے بے نیاز تھا، وہ تو کماری کی موجودگی اور اس کی اتنی قربت کے نشہ میں سرشار تھا۔

کیوں نہ ہو؟ عورت کی قربت کا احساس خود ایک نشہ ہوتا ہے "کماری جی ــــــ"

"ہوں!"

"آپ نے کل وعدہ کیا تھا ـــــــ"

"کیا ـــــــ"

"آپ کو یاد نہیں؟ "WONDER FUL"

"نہیں"

"آپ نے آج گانا سنانے کا وعدہ کیا تھا"

"ع و ہ"

"تو سنائیے نا کوئی غزل ـــــ"

"لیکن میرا گلا خراب ہو چکا ہے، یہاں کے تھرڈ کلاس کھانے نے ـــــ"

"معاف کیجئے صاحب، جب کسی آرٹسٹ سے فرمائش کی جاتی ہے تو وہ عموماً یہی EXCUSE پیش کرتا ہے ـــــ"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"بالکل سچی بات کہی آپ نے" اختر جوش میں آیا، اور کمار سے بولا۔

"لیکن ہم غزل سن کر رہیں گے ـــــ"

"آپ INSIST کرتے ہیں۔ وہ قدرے شرمائی ـــ اچھا ایک غزل عرض کرتی ہوں ـــــ"

دوسرے لمحے وہ دھیرے کھنکار کر غالب کی غزل گانے لگی:

درد منت کش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

یا اللہ! اس عورت کی آواز میں کتنی تاثیر تھی
یہ آواز تھی کہ کنواری صبح کے پھوٹتے ہوئے جلوؤں کی دافتہ لنمگی تھی،
اس میں بہاروں کا حسن تھا، شادابی تھی، رعنائی تھی ـــــ کتنا جادو!
آواز جیسے روح کی عمیق ترین گہرائیوں میں اترتی چلی گئی ـــــ یہ
میرے خاموش احساسات کی سیمابی لہریں دل کے کناروں سے
ٹکرانے لگیں ـــــ کیا میرا دل وجگر اس آواز کی شدت تاثیر
کی تاب لا سکے گا؟ کہیں یہ دل پارہ پارہ نہ ہو جائے، جب سنگیت
کی لہریں ایک خوبصورت عورت کے گلے میں ڈھل جاتی ہیں، تو
سنگیت سنگیت نہیں رہتا جادو بن جاتا ہے ـــــ!!
میں مسحور ہو کر اس آواز کے رنگ و بو کی لہروں میں ڈوب رہا تھا،
اور جب اس نے یہ شعر گایا

شعر
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!!

میں نے عقیدت اور احترام سے جھکتی ہوئی نظر اس پرستار
پر ڈالی، اس وقت مجھے ایک عام سی عورت دکھائی نہ دی، وہ مجھے
ایک دیوی سی دکھائی دی، ایک پوتر کلاکار، اس کے دہکتے ہوئے
رخساروں پر فن کی عظمت اور تقدس کی روشنی تھی، اس کی شخصیت
میں ایک انوکھا وقار آ گیا تھا، اس کی سیاہ آنکھوں میں تغزل کا نشہ
سمٹ کر آ گیا تھا، اس کے رسیلے عنابی ہونٹوں پر نغموں کے سوتے
پھوٹ رہے تھے،
یہ عورت کتنی عظیم ہے!

اس کی روح میں کتنی تابناکی ہے۔

"کلا کی دیوی ـــــــ!

میں بے حد متاثر ہوا۔

اور جب اس کے کانپتے ہوئے ہونٹ خاموش ہو گئے، انگلیوں کی لہریں تھرتھرا کر ڈوب گئیں میں نے کماری کی طرف دیکھا، اور دیکھتا ہی رہ گیا، اس کی دراز سیاہ پلکوں کے نوکوں پر آنسوؤں کے دو ستارے لرزاں تھے! جن کے سائے اس کے تپتے ہوئے رخساروں کو چوم رہے تھے، ان سایوں میں ستاروں کا حسن اور رنگ لرزاں تھا!!

میں بھر بلب اسے دیکھتا رہا

اور اختر بیچینی سے انگلیاں چٹخاتا رہا۔

"معاف کیجئے، سچ بات تو یہ ہے کہ میں اب بہت کم گاتی ہوں، نہ جانے کیا ہو گیا ہے مجھے، جب بھی گھر میں کوئی ساز اٹھا لیتی ہوں میرا دل بھر جاتا ہے۔

میری زندگی ہی ایسی ہے، زندگی نے مجھے بہت دکھ دئے ہیں ـــــــ"

ستارے اس کی پلکوں سے ڈھلک کر اس کے دہکتے ہوئے رخساروں کو چھو کر نیچے گر گئے ـــــــ!

اف یہ قاتل لمحہ! ـــــــ بھئی، یہ آنسو روک دو، میرا جگر خون ہو رہا ہے۔ میں ایک عورت کے آنسو کبھی برداشت نہیں کر سکتا، اور تمہارے آنسو ـــــــ، میری روح چیخ چیخ کر انس

کی سنت وزاری کر رہی تھی"

"میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا کہ آپ کوئی DECISIVE STEP اٹھائیے، ——"

اختر نے کہا، سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ ا

"DECISIVE STEP" —— ہنہ، آپ بھی کمال کرتے ہیں، مجھے اب "STEP" ہی کون سا اٹھانا ہے، اب رہ ہی کیا گیا میری زندگی میں —— میری قسمت ہی خراب تھی، میں کسی کو دوش نہیں دیتی، ——"

"آپ نے کسی آدمی کو بھیجا تھا ہسبنڈ کے پاس ——"

"ہم ملتے ہیں کبھی کبھی —— وہ بات بھی کرتے ہیں، لیکن لیکن جانے دیجئے اس TOPIC کو، میں —— میں بے کار آپ کو بور کر رہی ہوں

●

یہ دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کہ ان سب لوگوں کا خون سفید ہو چکا ہے۔ خواجہ صاحب حقے کے کش لے رہے تھے ذیلدار بڑی عقیدت سے شاہ صاحب کی چلم پر آگ رکھ رہا تھا، دو تین ڈرائیور باتوں میں مصروف تھے۔ اور صدر ملک کسی واحد غائب پر گالیوں کی بوچھاڑ کر رہا تھا، اور دین محمد حسب معمول چونے کے کام میں مشغول تھا ——— سب اپنے اپنے کام میں مشغول اپنی اپنی فکر میں غرق ——— اور ادھر کونے میں گھٹتی ہوئی تاریکی میں میاں خلیل جانکنی کے عالم میں تھا اس کے چہرے پر ورم آگیا تھا، اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، اس کی سانس اکھڑ چکی تھی، اس کی صورت پر موت کی پرچھائیاں کانپ رہی تھیں وہ رہ رہ کر زور سے کھانستا اور کھانسی سے بے دم ہو جاتا، میں اس کے قریب بیٹھا رہا، سکتے کے عالم میں، میں نے کئی بار اسے پکارا

"میاں خلیل، میاں خلیل ——— خلیل چاچا، تمہارا کیا حال ہے آج ———"

وہ ہر بار مجھے دیکھتا رہا، گھورتا رہا، اس کی نگاہوں میں وہی نرمی تھی جو اس کی زندگی کی ایک بڑی خصوصیت تھی!

اور مشکل سے یہ کہا ——— "ٹھیک ہوں، اللہ رحیم ہے، رحیم وکریم ——— سرحد کے اس پار ——— اس بار میری پوتی ——— "

مجھے اچانک محسوس ہوا کہ یہ انسان موت کے بالکل قریب ہے، لیکن یہ لوگ اس قدر بے پروا بیٹھے ہیں" یہ بے حس لوگ، ——— پتھر دل! ——— یہ مجرمانہ غفلت!

"بھئی دین محمد ———" مجھ سے رہا نہ گیا، میرا خون کھول رہا تھا،

"کہئیے جناب ———" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا، اسی روکھے پن کے ساتھ جو اس کی عادت تھی۔

"میاں خلیل کی حالت بہت خراب ہے ——— آپ نے دیکھی نہیں صبح سے اس کی حالت ———"

"میں نے کہا اس کی تو کل شام سے ایسی حالت ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر کو نہیں بلایا آپ نے؟ اس کا علاج نہ ہوا تو یہ مر جائے گا ———"

"مر جائے گا تو دنیا کا کاروبار بند نہ ہوگا ——— میں نے کہا "کیسی بات کرتے ہیں آپ کوئی پتھر سے پتھر دل والا بھی ایسی بات نہیں کر سکتا۔ ایک خدا کا بندہ مر رہا ہے "حضرت میں نصیحتیں سننے کا عادی نہیں ہوں، جو کچھ میرے بس میں تھا، کر چکا، صبح سے دو بار ڈاکٹر کو بلانے گیا، خود ہی دکان کو اللہ کے رحم وکرم پر چھوڑ کر ——— یہ دو چھوکرے

کھاتے ہیں پیتے ہیں، سوتے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں، ڈرا میری آنکھ اوجھل ہوئی یہ کوئی نہ کوئی چیز لے کر غائب ہوئے، بالکل ایسے جیسے گدھے کے سر سے سینگ —— آپ یہ باتیں نہیں جانتے صاحب —— خیر چھوڑیے، میں تو دوبارہ ڈاکٹر کو بلانے گیا، وہ سالا کہیں ملا نہیں۔ جیسے زمین نگل گئی ہے۔ اس کو میں نے کہا آپ کو ہمدردی ہے، تو آپ ہی جا کر لائیے اسے، اب تو ہسپتال کھل گیا ہوگا نہیں میں دونگا اور —— "

میں زیادہ سننے کی تاب کہاں سے لا سکتا تھا؟

میرے بس میں ہوتا تو دین محمد کو گولی مار دیتا۔

میرا سارا بدن کانپ رہا تھا!

اور میں ایک پاگل کی طرح ڈاکٹر کی تلاش میں دوڑا، برف کی سنگلاخ چٹانوں اور ٹیلوں کو روندتا ہوا، برف کے موٹے موٹے گالوں سے ٹکراتا ہوا، گرتا، پڑتا، پھسلتا، ہانپتا ہوا میں بازار کے اوپر پہاڑی راستہ پر چڑھتا گیا، —— میرے قدم سیدھے نہیں پڑ رہے تھے، برف میں آج ابھی کسی نے راستہ بھی نہیں بنایا تھا، میں قدم رکھتا تو وہیں میرے پاؤں برف میں دھنس جاتے کل آدھ میل کے فاصلے کو طے کرنا تھا، لیکن اس وقت یہ مختصر سا فاصلہ کئی میلوں کا طویل فاصلہ بنتا جا رہا تھا —— میرے پاؤں ٹھٹھرتے گئے، میرا جوتا بالکل گیلا ہو گیا، میری ٹانگیں تھک کر چور ہو گئیں، میرا سارا جسم تھکاوٹ سے بوجھل ہوا۔ اور میں پسینے میں شرابور ہو گیا، لیکن میں تیز تیز قدم اٹھاتا رہا،

نہ جانے یہ طاقت کہاں سے آگئی تھی میرے جسم میں، میرا دل بےچینی کی حالت میں دھڑک رہا تھا۔ اور میری نگاہوں کے آگے میاں خلیل کی صورت رقصاں تھی، بے بسی اور بےچارگی کی تصویر۔! موت کی تصویر!!

میں جب ہانپتے ہوئے، پسینے پسینے، بلند قامت پہاڑ کے دامن میں واقع ہسپتال کی چھوٹی سی عمارت میں داخل ہوا تو کمرے میں میری نگاہیں یکسر دھندلا گئیں، کمرہ بخاری اور ہیٹر سے گرم تھا، اور گرم بھاپ میری عینک کے شیشوں سے ٹکرائی اور شیشے دھندلا گئے۔

مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا،

میں نے جلدی میں رومال سے عینک صاف کی۔

سامنے کرسی پر ایک نوجوان بیٹھا تھا، قیمتی سوٹ میں ملبوس اور اس کے سامنے سٹول پر ایک بیس بائیس سالہ لڑکی بیٹھی تھی، دوپٹہ اس کے سر سے ڈھلک کر اس کے شانوں پر آگیا تھا،

ڈاکٹر صاحب ـــــ ڈاکٹر صا ـــــ حب ـــــ "

میں ہانپ رہا تھا!

میں بے دم ہوتا رہا تھا ـــــ!

میرے ماتھے اور چہرے پر پسینے کے ریلے رواں تھے!

ڈاکٹر نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا، اور لڑکی نے گھبرا جلدی سے دوپٹہ سر پر ڈال دیا،

" ڈاکٹر صاحب ـــــ وہاں بازار میں ایک آدمی جان دے رہا

ہے، آپ تکلیف کیجئے ـــــ مہربانی کیجئے، میرے ـــــ میرے ساتھ چلئے، آپ ـــــ"

"آپ دیکھتے نہیں، اس وقت یہاں میری ڈیوٹی لگی ہے ـــــ میں آوٹ ڈور پیشنٹ کو دیکھنے سے معذور ہوں ـــــ"

"ڈاکٹر صاحب ـــــ!!

"دیکھیے جناب ـــــ" ڈاکٹر میری وحشت دیکھ کر قدرے نرم پڑ گیا ـــــ "آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے، یہاں اس وقت میں آن ڈیوٹی ہوں ـــــ آپ بیمار کو یہاں لائیے ـــــ" "اس کی

"اس کی حالت بہت خراب ہے، اس کی سانس اکھڑ رہی ہے۔ اسے یہاں تک لایا جائے تو وہ پہلے ہی مر جائے گا، ڈاکٹر صاحب آپ کو یہ تکلیف اٹھانا پڑے گی ـــــ آپ کو برن سے ڈر لگتا ہے، لیکن جناب یہاں ایک انسان کی زندگی کا معاملہ ہے ـــــ اگر ـــــ اگر آپ نہ آئے، تو ـــــ تو اس بے گناہ آدمی کی موت کے ذمہ دار آپ ہوں گے ـــــ"

آپ ـــــ"

میں ایک پاگل کی طرح چیخ رہا تھا۔

میرے ہونٹوں پر جھاگ آ گئے تھے!

کمرے میں ایک کمپونڈر اور دو خدمت گار آ کر کھڑے ہو گئے تھے اور منہ کھولے مجھے گھور رہے تھے!

وہ لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی تھی، اور مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ چیختے کیوں ہیں؟ ـــــ میں آپ کی تقریر میں کوئی INTEREST نہیں رکھتا ـــــ"

ڈاکٹر نے تنک کر کہا۔

میرا دل ڈوبنے لگا۔

میں سارے ہتھیار آزما چکا تھا۔

"گوپال، میری برساتی دینا ذرا ـــــ" اچانک، وہ کندھے جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا، اس نے دستانے پہن لئے سٹیتھسکوپ اٹھایا، اور چڑ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"چلئے ـــــ یہ بلڈپریشر والی مشین اٹھائیے ـــــ" وہ سرد اور دھیمے لہجے میں بولا۔

میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

اور چلتے چلتے اس نے لڑکی سے کہا۔

"تم آج بھی وہی پلز لے لو، کل ڈیرے پر آجانا، سب ٹھیک ہو جائے گا ـــــ"

ہم دونوں برف سے الجھتے ہوئے چلتے رہے۔ خاموش خاموش میں آگے آگے، اور ڈاکٹر میرے پیچھے!

ہم جلد ہی دکان پر پہنچ گئے۔

میں دوڑتا ہوا، ڈاکٹر سے آگے دس قدم دکان کے پتھر دل کے زینے پر چڑھا، دکان پر خریداروں کی ایک بھیڑ تھی۔

"جگہ چھوڑ دو ـــــ جگہ چھوڑ دو جی، بھئی ہٹ جاؤ ـــــ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں ـــــ"

میں دکان کے اندر آیا۔ اور میرے پیچھے ڈاکٹر صاحب بھی ——

دکان میں گہری خاموشی تھی! خاموشی، ویرانی، افسردگی!!
سب لوگ منہ لٹکائے بیٹھے تھے، جیسے ان لوگوں کو سانپ سونگھ گیا تھا —— !

اور اچانک میں جیسے سکتے کے عالم میں آگیا —— میاں خلیل دم توڑ چکا تھا، !

وہ پاؤں پسارے، اپنے پرانے بوسیدہ کمبل کے نیچے ابدی نیند سو رہا تھا۔

اس کے زرد بے جان چہرے پر نرمی تھی، نرمی اور سکون!!

میں اس شام کو صبح کا نکلا ہوا والیس ہال کی طرف جا رہا تھا۔ تھکا ہارا، افسردہ حال۔ اور جونہی میں ہال کے برآمدے کے نزدیک پہنچا، میرے کانوں سے لوگوں کا ملا جلا شور ٹکرایا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا سامنے برآمدے پر ہال کے دروازے کے سامنے بہت سے لوگ کھڑے تھے، اور زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ ان آوازوں میں غم و غصے کی کیفیت تھی۔ میرے تعجب کی حد نہ رہی، جب میں نے ان سبھوں میں غلام محمد کی بیوی بھی دیکھی، جو روتی ہوئی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی، اس کا چہرہ سرخ تھا، آگ کا انگارہ! اور آنکھیں پُرنم۔ غلام محمد اس کے قریب ہی کھڑا تھا، اور چلا چلا کر بازو ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا،

"یہ بدمعاشوں کی ایک ٹولی ہے۔ شراب پی کر ان کے ہوش گم ہو جاتے ہیں، بیوی اور بہن میں تمیز نہیں کر سکتے، میں کہتا ہوں ان بدمعاشوں کو گولی سے اڑا دینا چاہیے،

چور، اچکے، بدمعاش، کمینے ——"

"آخر ہوا کیا ——؟"

"ہونا کیا تھا ——" انور صاحب نے میرے قریب کھڑے ہو کر کہا، "ابھی ابھی غلام محمد کی بیوی کمرے سے باہر نکلی، کسی کام سے گئی تھی ——"

"میں تو کانگڑی سے راکھ نکال رہی تھی ــــــ" بیچ میں غلام محمد کی بیوی بول اٹھی۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس کی ہرنوں جیسی آنکھیں نم آلود تھیں!!

"ہاں تو یہ کانگڑی سے راکھ پھینک رہی تھی، کہ چند آدمی برآمدے سے گذرے، اور انہوں نے کمینہ حرکت کی ــــــ اس کی چیخ سنکر ہم سب باہر دوڑے، اور وہ تینوں آدمی رفوچکر ہو گئے ــــــ"

"میں نے ان تینوں آدمیوں کو لیبارٹری کی بلڈنگ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا" سمار چند نے آنکھیں جھپکا کر کہا،

"یہ وہی لفنگے ہیں، جو یہاں چکر کاٹتے رہتے ہیں، آپ نے بھی دیکھا ہے ان کو انور صاحب ــــــ کل صبح کو یہ لوگ سویرے آئے اور اندر ہمارے باتھ روم میں منہ دھونے چلے گئے ــــــ"

"اچھا تو یہ وہی لوگ ہیں ــــــ سمجھا، لیکن میں نے کل ہی آپ سے کہا تھا، کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے ــــــ"

"میں نے بھی دیکھا تھا ان کو" آنند رام رازداری سے بولا۔ "ان کا لباس ان کی شکل سے ان کے اطوار سے پتہ چلتا تھا کہ یہ اچھے انسان نہیں ــــــ آدمی دور ہی سے پہچانا جاتا ہے کیوں انور صاحب ــــــ"

"اور کیا پنڈت جی؟ ــــــ"

"زمانہ ہی خراب آگیا ہے، لوگوں کے دلوں میں قیامت کا خوف ہی نہ رہا ــــــ" دیوار کے ساتھ لگے ہوئے اسمٰعیل بوڑھا نائب نے پتلی سی آواز میں کہا۔

انور مجھے یاد آیا، ایسا ہی حادثہ ان کے ساتھ ڈاک بنگلے کے کمرے

پر بھی پیش آیا تھا ـــــــ لیکن غلام محمد نے اس بارے میں مطلق ذکر نہ کیا، اور اس کی بیوی بھی خاموش رہی۔

میں نے دیکھا کہ ایک مختصر سے ہجوم میں ہال کے ساتھ ملحق کمرے میں رہنے والے چند آدمی بھی کھڑے تھے، کاروباری لوگ، بمبئی اور دہلی سے سرینگر آ رہے تھے،

"میرا خیال ہے غلام محمد اب اندر چلتے ہیں، وہ لوگ تو چلے گئے ہیں۔ یہاں رہنا بیکار ـــــــ"

"جی ہاں، یہاں سردی بھی لگ گئی ـــــ" انور صاحب نے فوراً میری تائید کی۔

"چلو، چلتی کیوں نہیں، یہاں سردی سے جان نکلے گی، غلام محمد نے بیوی سے کہا، اور وہ دونوں اندر ہال میں آ گئے۔

سب ایک ایک کر کے ہال میں گھسنے لگے۔

ہال بجلی کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔

"کلجگ ہے، کلجگ ـــــــ لوگوں میں اب شرم وحیا نام کو نہیں رہا ہے، رام رام، بوڑھی نیڈ تائی حیرت اور تشویش سے کہہ رہی تھی، پوپلے منہ سے،

ادھر ٹائمر کی نیڈ تائی کے پاس آشا سہم کر بیٹھی ہوئی تھی، سب لوگ اپنی اپنی مخصوص جگہوں پر بیٹھ گئے،

کچھ دیر تک سب خاموش رہے، اپنے اپنے خیالوں اور شبہوں میں گم!

آنند جو نے واسکٹ کی اندرونی جیب سے عینک نکالی، اور ناک پہ

چڑھا دی، اور وہ مذہبی کتاب میں گم ہو گئے! سمار نبیہ نے سٹوو جلانا شروع کر دیا، اور آشا بہن نے کمرہ ہائے رہائش میں پانی بھرنے چلی گئی۔

اچانک غلام محمد اپنی جگہ سے اٹھ کر انور صاحب کے پاس آ کر بیٹھ گیا، اس کا چہرہ اسمال جو ڈرائی کلینر اور میری طرف دونوں کی طرف اٹھا، اور اس نے رازداری کے ساتھ ہم سے کہنا شروع کیا

"میں ایک بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں ——" اس کے لہجے میں کپکپی تھی، عاجزی اور بے بسی کا درد تھا۔

"کہیے، کہیے، ضرور کہیے ——" انور صاحب نے متوجہ ہو کر کہا۔

ڈرائی کلینر نے گردن سارس کی طرح آگے بڑھا دی، اور میں سراپا... گوش بن گیا۔

"مجھے یہ بات پہلے ہی آپ سے کہنی تھی، لیکن میں سمجھا کہ بات دب گئی —— آپ میرے بھائی ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ بدمعاش جموں ہی سے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں"

"جموں ہی سے ——" ڈرائی کلینر کی پتلی سی آواز خوف زدہ تھی۔ انور صاحب نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"اچھا تو پھر ——"

"اڈے پر مجھ سے بار بار پوچھتے رہے، کہ یہ عورت آپ کی کیا لگتی ہے —— میں جل ہی تو گیا۔ میں نے کہا یہ میری بیوی ہے، اور وہ ایک قہقہہ لگا کر چلے گئے، عجیب بات ہے ان کو کیا پڑی ہے کہ کسی کے معاملات میں دخل دیں —— اور پھر —— خیر جانے دیجیے، یہ لوگ ادھر ڈاک بنگلے میں بھی آتے رہے، اور —— اور، خیر جانے دیجیے

میں نے آپ کو نہیں بتایا، یہ دو تین روز سے یہاں بھی آتے رہے، یہ یہ بات ہی آپ کو اپنا ہمدرد اور بھائی سمجھ کر کہہ رہا ہوں، آپ نے مجھے یہاں جگہ دی، اور ہم سے جو نیک سلوک کیا، وہ ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا، لیکن ان لوگوں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ آپ بھی مان جن والے ہیں، یہ ڈرا ئیور ہیں شاید، ...تو میں ہی جاتا، لیکن وہاں لینے کے دینے پڑیں گے، اور بدنامی ــــــ"

اس کی آواز میں بڑی بے بسی اور عاجزی تھی، یہ بات کہتے ہوئے اس کے چہرے پر پسینے پھوٹنے لگے، اور میرے دل میں اس کے لئے اس کی بے بسی پر رحم، اس کی سادگی کے لئے، ہمدردی جاگ رہی تھی، یہ آدمی واقعی مجبور ہے، ایک شریف انسان ان حالات میں کر ہی کیا سکتا ہے! اس آدمی نے ایک شریف انسان کی طرح ہم پر اپنا راز کھول دیا تھا، ہمیں رازدار بنایا ہے اور ہم سے مدد کی توقع رکھ چکا ہے۔

"یہ بات ہے" اب سمجھا ــــــ" انور صاحب نے ...کو کئی بار ہلا کر کہا ــــــ "آپ مطمئن رہئے غلام محمد، انشاءاللہ ...گا، یہاں ہمارے دم میں دم ہے، آپ کی عزت پر کوئی آنچ نہ آنے پائے گی، ہم خود بھی کوئی صورت نکالیں گے ان سے نمٹنے کی، ــــــ"

"آپ بالکل خوش رہئے، ہم اتنے لوگ، آپ کے ساتھ ہیں آپ یقین رکھئے، آپ کی عزت ہماری عزت ہے ــــــ"

"اور کیا ــــــ!" اسمال جوڑا کی کلینر غیرت کے گرداب سے ابھر رہا تھا

"اچھا کیا آپ نے پولیس کو اطلاع نہ دی، ورنہ تو بات بہت بگڑ بن جاتا۔"

انور صاحب نے صلاح دی۔

"اب میں آپ کے مشورے ہی پر چلوں گا۔" غلام محمد قربانی کے بکرے کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی بیوی کی طرف دیکھا، وہ منجی پر بیٹھی تھی، اور دوپٹے کے پلو سے کھیل رہی تھی، اور ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا۔ ایک رنگ جا رہا تھا۔

"آپ بیٹھئے اطمینان سے، میں رفیق صاحب سے بات کروں گا، ہم ضرور کوئی صورت نکالیں گے، اور یہ بلا خود بخود ختم ہو جائے گی۔"

غلام محمد اٹھا، اس نے پیچھے سے بیوی سے بات کی، اور کونے سے چادر اوڑھ کر باہر نکلا، شاید وہ بازار سے پکی پکائی روٹی لانے چلا گیا تھا۔

مجھے بھی کھانے کا خیال آیا۔ آج دن بھر میں نے پانی کا ایک قطرہ بھی حلق سے نہیں اتارا تھا۔ میری انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں، میں اٹھا اور ساتھ ہی انور صاحب اور جمال جو ڈرائی کلینر ہے دونوں اٹھے، اور ہم تینوں دین محمد کی دکان کی طرف کھانا کھانے چلے گئے۔
راستے میں ہم نے غلام محمد کے مسئلے پر بات کی، اور طے یہ ہوا کہ ان غنڈوں کے منہ لگنا بجائے خود حماقت ہے، یہاں وہ لوگ جب بھی ادھر سے آیا کریں، یا یہاں میں داخل ہونا چاہیں، تو انہیں کوئی مزاحمت نہ کی جائے، صرف یہ کیا جائے کہ جونہی وہ آئیں، تو انور صاحب زبردست سیٹی

اللہ کی تفصیلات سنایا کریں، قرآن اور احادیث بیان کریں، الغرض
وہ فوراً مذہبیات پر تقریر کرنا شروع کریں گے خشوع اور خضوع سے ساتھ
اور ہم تمام تر توجہ کے ساتھ سنتے رہیں ———— !
یہ تجویز انور صاحب کے دماغ میں آئی تھی،

میں سردار جی کی دکان کے چھجے پر کھڑا تھا، کچھ دیر سے برف نہیں گر رہی تھی، جب ہال میں کول صاحب نے داخل ہو کر یہ خبر سنائی کہ برف نہیں گر رہی ہے تو ہمارے دلوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، آج اتنے دنوں سے مسلسل برف گر رہی تھی، برف کے موٹے موٹے گالے یخ بستہ گالے رات دن برف گرتی رہی، صبح و شام برف گرتی رہی، برف ہی برف۔ اور برفیلی ہوا کے تند و تیز جھکڑ، برفیلی دھند، گاڑھی دھند، اتنی گاڑھی کہ چاروں طرف برف سے جگمگاتے ہوتے پہاڑوں کے لاانتہا سلسلے تاریکی کے پردوں میں چھپ جاتے، درخت مکان، دکانیں، راستے سب کچھ اندھیروں میں غرق ہو جاتا ——— اندھیروں کی قبر منہ کھولے ہوئے سامنے آ جاتی! اور چلتے چلتے انسان گھبرا کر رک جاتا، قدم رک جاتے! نگاہیں تاریکی میں بھٹک جاتیں، اور انسان سراسیمہ ہو کر بت کی طرح ساکت رہ جاتا!

تاریکی کے بغیر اور کسی چیز کا وجود باقی نہ تھا۔

پھر دھند آہستہ آہستہ چھٹنے لگی۔

پھر وہی برف، برف ہی برف ——— جدھر نگاہیں اٹھتیں برف کے پہاڑ ہی پہاڑ ——— نیلا آسمان بھی برف کا ایک وسیع اور

بیکراں سمندر دکھائی دیتا۔ جیسے آسمان، برف کے سمندر کو زمین پر اتار کر رہے گا، سارا سمندر، اور پھر سب اہلِ زمین برف کے اس دریا میں بہہ جائیں گے ——!

یہ اننت تا ہوا سمندر کب تک ٹھاٹھیں مارتا رہے گا؟ یہ پہاڑ جو یہ مہیب اور بھیانک پہاڑ، برف کے کفن اوڑھے ہوئے، موت کا یہ دیوتا —— یہ دیوتا بپھر چکے ہیں، یہ سب پہاڑ غیض و غضب کی حالت میں ہونٹ چباتے ہوئے، ہیبت ناک دہانوں سے دھواں اگل رہے ہیں —— یہ پہاڑ سازش کر چکے ہیں، انہوں نے آسمان سے سازش کی ہے، چنگھاڑتے ہوئے بادلوں سے سازش کی ہے۔ باد و باراں کے چیختے ہوئے بھوتوں سے سازش کی ہے —— یہ سب غیبی اور شیطانی قوتیں ایک دوسرے سے مل چکی ہیں، انہوں نے ایک محاذ کھڑا کیا ہے، یہ طاقتیں انسان کی بے بسی اور بے چارگی کا تمسخر اڑا رہی ہیں، یہ انسان کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کے منصوبے باندھ رہی ہیں، انہوں نے انسان اور فطرت کی طوفانی مخالف اور ستیزہ کار قوتوں کی ازلی اور ابدی آویزش اور کشمکش کی تجدید کی ہے۔ یہ آویزش اور کشمکش آج بھی جاری ہے۔

انسان اور فطرت کی طوفانی طاقتوں کی کشمکش —— یہ کشمکش کہاں جا کر ختم ہو گی ——!

سامنے سڑک پر دھند آہستہ آہستہ چھٹ رہی ہے،

سڑک پر مزدوروں اور قلیوں کا ایک لمبا جلوس چلا آ رہا ہے۔ ایک لمبا جلوس، پھٹے کپڑے لوگ، تنومند، مضبوط ہاتھوں والے۔ پیچھے

کی سختی اور کھردری جلد پر ارادوں کی آگ لیے ہوئے، محنت کا تقدس اور وقار لیے ہوئے، پلکوں پر عزم و یقین کے چراغ جلائے ہوئے۔"

یہ فولادی انسان، جو برف کے پہاڑوں کو روندتے چلے جا رہے تھے، پاؤں میں گھاس کے بنے ہوئے چپل پہنے ہوئے، ٹانگیں گھٹنوں تک برفاب میں بھیگی ہوئی، بدن کو چند پھٹے پرانے کپڑوں سے ڈھانپے ہوئے ــــ یہ لوگ برف سے بے پرواہ لمبے لمبے ڈگ بھر رہے تھے اپنے شریانوں میں عزم و عمل کی پگھلتی ہوئی آگ لے کر نئے نئے فولادی ہتھیار کندھوں پر سنبھالے ہوئے ــــ یہ برف کے انسان آگے بڑھتے جا رہے تھے، ــــ آگے ہی آگے ــــ تخریب کے بھیانک دیوتاؤں کی کلائی مروڑنے کے لیے، یہ تعمیر و محنت کے پروردگار ــــ یہ انسان ــــ جو ہمت نہیں ہارتے، قدم نہیں رکتے، تھک ہار کر بیٹھ نہیں جاتے، شکایت نہیں کرتے ــــ یہ انسان کی ازلی جد و جہد کے علمبردار ــــ

پہاڑ اپنی شیطانی قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ برف کی چٹانیں بن جاتی ہیں، راستے مسدود ہوتے ہیں، بادوباراں کے طوفان مسافروں کو ہراساں کرتے ہیں، بادلوں کے دیو چنگھاڑتے ہیں، بجلیاں آگ برساتی ہیں، تاریکیاں زنجیریں بن جاتی ہیں۔ لیکن اس وقت بھی یہ فولادی انسان فطرت کی اندھی قوتوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں، اپنے فولادی بازوؤں کو حرکت میں لاتے ہیں، کلہاڑوں، پھاوڑوں، اور بیلچوں کی آوازیں فضا کے برف آلود سناٹے میں حیات اور عمل کی جھنکاریاں بھر دیتی ہیں، چٹانیں ٹوٹ کر رہ جاتی ہیں، برف کے پہاڑ ننگے ہوتے

ہیں، شرمندہ ہوتے ہیں۔ تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں، اور بادل کی مغرور موجیں افق کے غاروں میں سر چھپاتی ہیں، ——— "

اور انسان کے قدم نئی نئی منزلوں کی تخلیق کرتے ہیں۔

راستے جگمگاتے ہیں، راہیں کھلتی ہیں ——— اور انسان باجاہ و جلال وقار اور تمکنت کے ساتھ، آنکھوں میں خوابوں کا نور لئے آگے بڑھتا ہے، فتح مندی کے پرچم لہراتے ہیں ——— رنگ و نور کی بارش ہوتی ہے ——— پھول کھلتے ہیں ———

رفیق صاحب ——— "سردار جی جو چولہے کے نزدیک ایک سٹول پر بیٹھے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے مخاطب ہوئے "رجی ———" میں نے اس کی طرف دیکھا، میں جلدی سے وہاں سے کھسکنا چاہتا ہوں، حالانکہ سردار جی اور پریم کمار دونوں کو آج میں نے کئی روز کے بعد دیکھا تھا، جب سے میں گوردوارے سے بھاگ آیا تھا، وہ مجھے کبھی نظر نہ آئے۔ اور آج چلتے چلتے سردار جی نے مجھے آواز دی تھی، میں ان کے پاس آیا، اور دونوں نے خوب شد و مد سے مجھ سے شکایت کی کہ میں چپکے سے وہاں سے بھاگ نکلا، پریم کمار دکان کے اندر کپڑوں کی گٹھری میں جھانکتے ہوئے بڑھ چڑھ کر شکایت کر رہے تھے، وہ آج بہت دبلے ہو گئے تھے، چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، ان کی چھوٹی چھوٹی زرد آنکھوں میں بے حسی تھی، مردنی تھی ——— اور مجھے پتہ چلا کہ وہ بھی دوسرے ہی دن گوردوارے کو خیرباد کہہ کر سردار جی کے ساتھ اس تاریک اور گندی دکان میں گھس آئے تھے۔ اور جب سے یہیں پڑے تھے

میں نے بھی مختصر الفاظ میں اپنی روداد سنائی۔

"میں نے کہا پادشاہو —— واہگرو کی کرپا ہے، برف اب رک گئی ہے —— سردار جی پر امید لہجے میں بولے۔

"اور کام بھی لگا ہوا ہے زوروں پر —— اندر سے پریم کمار کی نحیف آواز آئی۔

"برف رک جاتی، تو زیادہ سے زیادہ ایک دو دن میں راستہ بن جاتا، لیکن یہ برف ——" میں نے کہا،

"اتنی ساری برف میں نے زندگی بھر نہیں دیکھی ہے ——" سردار جی پھر چولہے پر جھک گئے۔

اور میں وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ سامنے سے ٹریفک انسپکٹر آتا ہوا دکھائی دیا، اس کے ساتھ کچھ اور آدمی تھے، میں نے ان میں جوشیلے نوجوان کو پہچانا، جو ہاتھ ہلا ہلا کر اس سے باتیں کر رہا تھا، میں نے جلدی سے پریم کمار اور سردار جی سے رخصت چاہی، اور ٹریفک انسپکٹر کے قریب آیا، لیکن میں اس سے، ہونٹوں تک آئے ہوئے اس سوال کو پوچھ نہ سکا کہ بھئی سردار صاحب کیا حال ہے، راستہ کا، وہ خود ہی بولے، جوشیلے نوجوان کے سوال کے جواب میں، آنکھیں اور چھوٹی سی گول سرخ رنگ کی چھڑی ایک ہی رفتار سے گھماتے ہوئے۔

"کام لگا ہوا ہے، کئی بلڈوزر کام کر رہے ہیں، راستہ بنتا ہے پھر خراب ہو جاتا ہے۔ پھر بنتا ہے، پھر خراب ہوتا ہے۔ برف نے ستیاناس کر دیا ——"

یہ کہہ کر وہ سامنے کی دکان کی طرف جانے لگے، جس میں ریڈیو پر کسی عورت کے گانے کی آواز گونج رہی تھی —

میں آگے چلا آیا۔

اچانک میں بہت اداس ہوا۔

اداسی کی یہ لہر کتنی تیز تھی، کتنی شدید!!

دفعتاً تاریک اور ویران سائے میرے دل کی وادیوں پر پھیلتے گئے —— پھیلتے ہی گئے —!!

یہ اداسی —!

یہ تاریکی —!

یہ بے چارگی —!

یہ اجاڑ پن —!

مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک ایسا پرندہ ہوں، جس کے پر کاٹ کر ایک بے آب و گیاہ صحرا میں چھوڑ دیا گیا ہے، جہاں حد نگاہ تک ویرانے ہی ویرانے ہیں، ریت ہی ریت ہے، تاریکی ہی تاریکی ہے اور موت سامنے کھڑی، جبڑے کھولے قہقہہ لگا رہی ہے —— اف!

کیا کبھی وہ وقت آئے گا کہ میں برف کے اس زندان سے نکل جاؤں گا اور ان پہاڑوں کی غضبناک اور قہر آلود نظروں سے دور ہو جاؤں گا، —— کیا وہ وقت آئے گا کہ پھر میں اپنی سکوں پرور رنگین اور بہار انگیز وادی میں قدم رکھوں گا —— اور اپنے عزیزوں کے مہربان اور شفیق چہروں کو دیکھ سکوں گا! —— کیا وہ لمحہ کبھی آئے گا، کہ میں اپنی رشی کا کوئی پیغام سن سکوں گا!"

وہ لمحے کہاں کھو گئے؟
وہ لمحے کہاں کھو گئے؟ میرے اللہ! یہ ویرانی کہاں سے آ گئی! مجھے اس تاریک زنداں میں کس نے گرفتار کیا؟ کیوں گرفتار کیا؟ میرا جرم کیا تھا؟ یہ تنہائی ۔۔۔ یہ روح کی گھٹن، یہ لوگ کہاں چھپے گئے تجھے یہاں! یار و مددگار چھوڑ کر کہاں کھو گئے۔؟

میری سلگتی ہوئی پلکوں پر کئی آنسو لرز رہے تھے، مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے غم کی شدت سے میرا وجود پارہ پارہ ہو جائیگا بے مقصد چلتا رہا ۔۔۔ میں ڈاک بنگلے کی سڑک پر دور تک نکل آیا۔ راستے سے برف ہٹائی گئی تھی، اور راستے کے دونوں طرف پہاڑوں کی اونچی دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں، آگے جہاں تک نظر جاتی تھی مزدور ہی مزدور نظر آ رہے تھے، جو برف کے ہٹانے کے کام میں مصروف تھے۔ میں کچھ دور اور چل کر واپس لوٹا۔ میں نے کھل کر رو دیا تھا! اور اب میرے آنسو خشک ہو چکے تھے،

دل کا بوجھ قدرے ہلکا پڑ گیا تھا!!

ڈاک بنگلے کے نزدیک پارک کی سیڑھی پر اختر صاحب کھڑے تھے انہوں نے دور ہی سے مجھے دیکھ کر پکارا۔

"بھئی رفیق صاحب۔۔۔۔"

اور میں ان کے قریب آیا، وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے اپنے کمرے میں، کچھ دیر تک ہم بیٹھے رہے حالانکہ میں جلد، سے بھاگ جانا چاہتا تھا، میرا دل اب بھی بجھا بجھا سا تھا، لیکن میں نے اپنی اندرونی کیفیت کا اختر کو اندازہ نہ ہونے دیا۔ میں ظاہری طور پر اس کے ہنسی مذاق کی

باتوں میں شریک رہا، اس نے کہا مدراسی ایکٹرلیسوں نے باقاعدہ PROSTITUTION شروع کر دیا ہے۔ اور شراب کی ایک بوتل تینوں عورتوں کے لئے مقرر ہو چکی ہے۔ وہ کہتی ہیں اس میں ان کا کوئی خسارہ نہیں، بلکہ فائدہ ہے، وہ چند لمحوں کے لئے بیچتی ہیں لیکن اس کے بدلے میں زندگی خریدتی ہیں ——— کیا نظریہ ہے "WONDERFUL" اور وہ ایکٹرلیس جو بیمار تھی ———

"بیمار ——— ہاہاہا ——— وہ اب بھی بھلی چنگی ہے، کوئی دن بھر غائب رہی، اور وہ چقندر، ان کے ساتھی، وہ تو دن بھر کمرے سے نکلتے ہی نہیں ان عورتوں کے جھوٹے پر پلتے ہیں ———"

اس کے بعد اختر نے خود ہی موضوع بدل دیا، وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے بارے میں کہنے لگا، وہ گھر جانا نہیں چاہتا تھا، لیکن والد صاحب کے پیہم اصرار پر وہ جا رہا ہے۔ والد صاحب نے ان کے لئے ایک گریجویٹ لڑکی دیکھی ہے اور پسند کی ہے، اور یہ دلی کے فوراً بعد بادام کے شگوفوں کے وقتوں میں شادی رچانے کا پروگرام ہے۔ وہ آج تک والد صاحب کی بات ٹالتا رہا تھا۔ لیکن اب وہ ہار گیا۔

اور جب میں وہاں سے اٹھ کے چلا آیا، تو میں، بے حد بور ہو رہا تھا، میں برآمدے سے گذر رہا تھا، کماری کے کمرے کے نزدیک آیا۔ کہ اچانک کھڑکی کھلی، جیسے بہار کا ایک عنبریں جھونکا میرے سامنے سے گذر گیا!

کماری کھڑکی پر تھی۔

اس کے مہکتے ہوئے، لہراتے ہوئے سیاہ ریشمی بال کھڑے

تھے۔ اس کا سیاہ ریشمی ڈوپٹہ اس کے شانوں پر ڈھلک آیا تھا اور اس کے بلیو سویٹر کی چھاتی کے بٹن کھلے تھے، اور قمیض کے گریبان نے اس کے دودھیا رنگ کے سینے کا بہت زیادہ حصہ کھلا تھا، مرمریں گولائیوں کے بیچ کی شفاف گہرائی ـــ

وہ کھلی ہوئی کھڑکی پر ہونٹوں پر نرم تبسم کے دیپ جلائے مجھے دیکھتی رہی،

"دیپ جلتے رہے"

اور میں اس کے نکھرے ہوئے حسن و جمال اور قیامت آفریں شباب کو دیکھتا رہا، دیکھتا ہی رہا، میرے ہونٹ خاموش تھے۔ اور نگاہیں اس کے جسم کی شادابیوں میں بھٹک رہی تھیں؟ اس کی نشیلی آنکھوں پر اس کے دراز پلکوں کے ریشمی سائے، جیسے جادو کے سائے تھے!

"آپ تو نظر ہی نہیں آئے ان دنوں ـــ" وہ خوابناک لہجے میں گنگنائی۔

"جی ـــ میں اس طرف آیا نہیں ـــ"

"آپ نے کہا تھا کہ آپ روز آیا کریں گے ـــ"

"مجھے افسوس ہے، بات در اصل یہ ہے ـــ"

"ابھی EXPLANATION سے میں یوں سننے کو تیار نہیں ـــ" وہ پھر مسکرائی۔

"اندر آئیے نا آپ ـــ"

میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا،

"آیئے نا، باہر اتنی سردی ہے، اتنی تیز ہوا ——— مجھے بھی سردی لگی ———" اس نے اچانک کھڑکی بند کر دی، اور میں ایک لمحہ کے لیے فیصلہ نہ کر سکا، کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر مجھے کوئی اس کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھ لے تو ———

لیکن اس کا خلوص، اس کی محبت، اس کا اصرار ———!!

میں کمرے کے اندر آگیا۔

کھڑکی کے نزدیک کماری کا بیڈ تھا، سامنے تپائی تھی جس پر کئی چیزیں رکھی ہوئی تھیں، میں بیڈ کے نزدیک آکر ٹھہر رہا۔ وہاں کمرے میں کوئی کرسی نہ تھی،

"آیئے، بیٹھیے یہاں ———" اس نے مجھے بیڈ پر بیٹھنے کو کہا، اس کے اشارے سے میں تھوڑے سے تکلف کے بعد بیڈ پر بیٹھا۔ کماری بھی وہیں بیٹھی، ٹانگیں سکیڑ کر، شانوں اور بازوؤں پر تولیہ سنبھال کر۔

"کہیے اب کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" وہ دھیمے سے بولی۔

"میں شرمندہ ہوں، میں اندر نہ آسکا، دراصل باہر دوکان کے مالک کی حالت خراب ہو گئی تھی، ورنہ میں کل ہی آتا، لیکن کل ایک آدمی مر گیا۔"

"مر گیا ——— کون ———؟"

وہاں دوکان میں ایک بوڑھا آدمی کام کرتا تھا، نمونیہ ہو گیا اسے میں ڈاکٹر کو لانے گیا تھا کل صبح کو، لیکن وہ مر چکا تھا ———"

"بیچارہ ———!"

"آج صبح ایک اور آدمی کی لاش پائی گئی ———"

"کہاں ———؟"

"سڑک کے اس طرف ایک سبزی والے کی بند دکان پر، معلوم ہوا کہ بیچارہ رات کو سردی سے مر گیا ہے ——"

"سچ بڑی سردی ہے، اتنی سردی تو سرینگر میں کبھی نہیں لگتی —— رات کو مجھے نیند نہیں آئی، بار بار آنکھ کھلتی ہے، یہ رضائی یخ ہو جاتی ہے اس کی پلکیں بھرا بھرا ہیں؟ —— میرے تصور میں ایک شاداب جھیل ابھر آئی اور جھیل کے کناروں پر بید کی نازک شاخوں کے کانپتے ہوئے خواب آگیں سائے —— !!

اور سارا جسم برف بن جاتا ہے، "آج رات مجھے زیادہ ہی سردی لگی، میں کانپ رہی تھی، اس وقت بھی) میرے جسم سے سردی کی لہریں اٹھ رہی ہیں ——"

اس نے اپنے سارے جسم کو یوں سکیڑ لیا، جیسے وہ ربر کی بنی ہوئی کوئی مورتی ہو، غیر اختیاری طور پر اس کے جسم کو جھٹکے لگے جیسے اسے جھرجھری آگئی ہو:

"میرے ہاتھ پاؤں سردی سے ٹھٹھر جاتے ہیں —— یہ دیکھئے میرا ہاتھ سردی سے کتنا سرد ہے، دیکھئے —— دیکھئے نا"

اچانک اس نے دوپٹے سے ہاتھ نکالا —— ایک دست مرمریں، لمبی لمبی نازک، مخروطی انگلیاں —— ایک کلاکار کی انگلیاں ہاتھ میری طرف بڑھنے لگا۔ یہ ہاتھ دست رنگیں تھا!

میں ہچکچایا —— !

لیکن وہ اپنی بھرپور نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی، مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کی آنکھوں کی دبیز و عریض خواب آگیں وادیوں میں گم ہو گیا ہوں۔ —— اور ان کی دراز پلکوں کے لرزتے ہوئے سائے!

مجھے اپنے وجود کا احساس تک ہی نہ رہا ——!

کیسا لمحہ تھا یہ!

میں اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔

اور دوسرے لمحہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا!

میرا اپنا ہاتھ کانپ رہا تھا، جیسے ایک دہکتے ہوئے شعلے کو میں نے اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے لیا تھا!

اس کے ہاتھ کی نرمی اور آنچ میری رگ رگ میں اترتی چلی گئی! میرے کھردرے ہاتھ اب اس کی ہتھیلی کی گرمی محسوس کر رہے تھے!

"میں نامرد ——"

اچانک اس کی آنکھوں میں تند و تیز نشہ لہرایا۔

اس کا لہجہ لڑکھڑایا۔

اس کی سانسوں کے ریشمی تار الجھنے لگے۔

"نہیں تو ——" اگر میں اس کا ہاتھ چھوڑ دیتا، تو یہ شاید نیچے بیڈ پر آ گرتا، اس نے پوری بانہہ کا بوجھ میرے ہاتھ پر ڈال دیا تھا۔

"کیا کہا ——"

"میں نے کہا، آپ کے ہاتھ میں خاصی گرمی ہے ——" میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔

"یہ تو آپ کے اپنے ہاتھ کی گرمی ہے ——"

وہ سچ مچ بہک گئی تھی۔

اس کی ہر ادا میں خودسپردگی تھی! جیسے صبا کے جھونکوں سے

شاخ گل جھک آئی ہو!

اچانک وہ میرے قریب آئی، اور اس کا سر میرے سینے سے جا لگا۔ میرا دماغ اس کے بالوں کے عنبریں سایوں میں ڈوب گیا اور ـــــ اور میں اس کے کانپتے ہوئے، رس بھرے عنابی ہونٹوں پر جھک گیا۔ میں نے اپنی پوری قوت سے اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے تپتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے۔

کماری کی بوجھل پلکیں بند ہو چکی تھیں ـــــ!

میرا وجود ایک انجانی، اجنبی وادی کی خواب ناک فضاؤں میں گم ہو چکا تھا ـــــ میں کہاں کھو گیا تھا!

میں نے سر اٹھایا۔ ایک خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔

کماری سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس کے رخسار تپ رہے تھے، اور اس کی دراز پلکیں جھکی ہوئی تھیں!

میرے جذبات کا آتش فشاں جیسے اچانک ٹھنڈا پڑ گیا۔۔۔ میری رگوں میں برف کی سِل پگھلنے لگی۔

دور پہاڑوں کے اس پار، وادی کی گلپوش فضاؤں میں رشی میرا انتظار کر رہی تھی۔

وہ بانہیں کھولے، پلکوں پر انتظار کی شمعیں جلائے، جدائی کی آنچ عارضوں پر لیے ہوئے ـــــ میرا انتظار کر رہی تھی!

انتظار کرتا ہے۔ اور درد وفا کا گداز ـــــ وہ وفا کی دیوی میں نے ... آج تک اس نے اس کی پاک اور مقدس امانت کو سینے میں چھپا رکھا ہے ... آج اس امانت میں خیانت نہیں کر سکتا

اچانک میں اٹھ کھڑا ہوا، اور کمہاری سے کچھ کہے بغیر میں وہاں سے چلا گیا۔

بڑی افسانوی رات تھی وہ!

ہم سب اپنے اپنے بستروں میں ٹانگیں پسارے، تکیوں سے شالوں اور گردن کو سہارا دیئے ہوئے، شمع کی مدھم مدھم، کانپتی ہوئی روشنی میں باتیں کر رہے تھے،

پورے ہال میں ایک شمع جل رہی تھی!

شمع پگھل رہی تھی ——!

وسیع ہال کے سائے تھرتھرا رہے تھے،

شمع کی ہلکی سی، مدھم سی لو، سمٹتے سمٹتے اندھیروں سے الجھ رہی تھی

شدید برف باری سے بجلی کے کھمبے گر چکے تھے، تاریں کٹ چکی تھیں!

ابھی ابھی شمع کی روشنی میں انور صاحب اپنا دیوان کھولے اپنی نظمیں سنا رہے تھے، خوبصورت اور پرتاثیر شاعرانہ لے میں!

ان کی نظموں میں سادگی تھی، سادگی کا حسن!

وہ عوام کی دھڑکنوں میں ڈوب کر حسین شعروں کی تخلیق کرتے اور اب ان کی شاعری میں ایک نیا موڑ آگیا تھا——!

وہ حسن مجاز کی محدود رنگین دنیا سے نکل کر حسن حقیقی کی لامحدود فضاؤں میں پرواز کر رہے تھے، وہ رسول میر کی رنگین اور

متوالی دنیا سے نکل کر للہ دت کی روحانی دنیا کے تہہ در تہہ اسرار کی نقاب کشائی کر رہے تھے ——!

ان کے اشعار روح میں صبح کے نوخیز اجالوں کا ارتعاش پیدا کرتے، انکے جذبات اور احساسات کے خلوص کی آنچ دل کو چھو جاتی ——! ایک سچا شاعر اپنی روح میں کتنی عظمتیں رکھتا ہے۔!

ہم ان کے اشعار سنتے رہے، اور بے اختیار جھو متے رہے۔! سمار چند واہ واہی کرتے رہے اور پلکیں بھی جھپکاتے رہے۔ اور آنند جو خاموشی سے سنتے رہے —— بوڑھی پنڈتانی رہ رہ کر آہیں بھرتی ——! آخر سنتے سنتے بیٹھی بیٹھی سو گئی تھی ——!

کول صاحب جو تھک ہار کر آ گئے تھے، اور حسب معمول چند خبریں سنا چکے تھے، اور بستر میں گھس کر سونے کی تیاری کر رہے تھے، لیکن جب سمار چند اور میرے بھی اصرار پر انور صاحب نے دیوان کھولا اور ان کی شاعری سے ہال کی ہلکی سی روشنی میں سوز اور تاثیر کی ہلکی سی لہریں جاگنے لگیں، تو کول صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے اور چپ چاپ سنتے رہے

غلام محمد چادر میں جسم کو لپیٹے ہوئے بیٹھا تھا، اپنی بیوی کے پاس ہی جو رضائی میں لیٹی تھی۔ اور اسمال جو ڈرائی کلینر انور صاحب اور میرے درمیان بیٹھا ہوا تھا، اور عقیدت سے سن رہا تھا۔

شاعری کا دور ختم ہوا، تو آنند جو نے حسب معمول دلچسپ انداز میں اپنے تجربات زندگی کے ورق الٹنا شروع کئے، آنند جو ایک دلچسپ شخصیت کا مالک تھا، پہروں تک خاموش رہنے والا یہ انسان

اور مذہبی کتابوں کا یہ شیدائی، جب بولنے کیلئے زبان کھولتا تو سننے والوں کے دل و دماغ پر چھا کر رہ جاتا ـــــــــ"

قریب قریب ہر رات سونے سے پہلے زندگی کے کسی نہ کسی تجربے، حادثہ یا واقعہ کا ذکر کرتا، اور ہمیں اُن کی باتوں میں افسانوی حسن اور دلکشی کا احساس ہوتا، اس آدمی نے بیس پچیس سال کی ملازمت کے دوران زندگی کے نشیب و فراز دیکھے تھے، وادی کے کونے کونے میں وہ رہ چکا تھا، دور افتادہ حصوں میں زندگی کے دن گزار چکا تھا، پہاڑی علاقوں میں شدید سردی اور برف میں اس نے ملازمت کی تھی، غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ اس مصیبت کی بھول کر بھی شکایت نہیں کر رہا تھا، جس میں ہم سب اتنے دنوں سے گرفتار ہو چکے تھے، اس کے موٹے موٹے بھرے بھرے چہرے پر ایک فطری سکون اور ٹھہراؤ تھا، اور وہ اطمینان سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا، جب موسم میں تبدیلی آئے گی، برف رک جائے گی، دھوپ نکلے گی، راستہ ٹھیک ہو جائے گا، اور ـــــــــ

" مجھے اچھی طرح یاد ہے ـــــــــ آنند جو بڑے آنند کے ساتھ کہہ رہے تھے،

ہم سب ہمہ تن گوش تھے!

" ہم ترا گہ بال کے نزدیک پہنچ رہے تھے ـــــــــ کہ اچانک سورج بادلوں کے پیچھے چھپ گیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے، برفیلی ہوا چلنے لگی ہماری جان ہی نکل گئی، موسم کی یہ اچانک تبدیلی دیکھ کر، لیکن ہم چلتے رہے ـــــ

"پنڈت جی، برف آرہی ہے ——" ایک دراز قد ادھیڑ عمر کے بیٹھی ناک والے تجربہ کار قلی نے کہا۔

"غلط، یہ کون وقت ہے برف کا ——" میں نے اس کی تردید کی، اور دوسرے قلیوں نے بھی میری بات کی تصدیق کی۔ بہت بڑا قافلہ جا رہا تھا، دس پندرہ آدمی گریز کے رہنے والے بھی، وہ قلی بھی جو بوقت برف باری راستہ بناتے، مضبوط لوگ، ہاتھیوں کی طرح کھانے پینے کا سامان بھی تھا کافی چار پانچ روز تک کے لیے کافی تھا اور ملک صاحب نائب تحصیلدار جی، ان کا تبادلہ گریز ہوگیا تھا، ہم تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ یکایک برف گرنی شروع ہوئی، ہم سب پریشان ہوئے لیکن چلتے رہے، قدم آگے بڑھاتے رہے، دائیں بائیں پہاڑوں کے سلسلے دھند میں چھپ گئے تھے، اور پتہ ہے کیا ہوا۔

آنند جو واقعات بیان کرتے ہوئے کسی اہم موڑ پر رک جاتے اور ہمارا تجسس نقطۂ عروج کو چھو جاتا۔

"کیا ہوا؟" کئی آوازیں آئیں۔

"جب ہم رازداں پاس کی طرف چڑھ رہے تھے، ہم چار پانچ فٹ کی برف کی سطح پر چل رہے تھے چبھتی ہوئی برفیلی ہوا کپڑوں پر برف کا بوجھ، اور خود گرم کپڑوں کا بوجھ! —— ہم چلتے رہے۔ اور قلی راستہ بناتے رہے، وہ مضبوط گٹا کس کے لمبے چوڑے چپل پہنے پہاڑ کی چڑھائی پر قدم بڑھا رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے ہم جا رہے تھے، ایک لمبی قطار جا رہی تھی، دن ڈوبنے سے پہلے ہم رازداں پہاڑ کے ٹاپ پر پہنچ گئے تھے، ہم سب لوگ پہاڑ پر بنی ہوئی سیڑھی

گھس گئے، ہم آگے جا ہی نہ سکتے تھے، کیسے جاتے کہاں جاتے برف غضب کی آرہی تھی، اور رکنے کا نام نہ لیتی تھی، سامنے کی بلند چوٹیاں برف سے ڈھک گئی تھیں، ہٹ کے پیچھے، بہت نیچے تک گہری، اندھی کھائیاں تھیں جو برف سے چھپ گئی تھیں بہت خوفناک لگ رہی تھی، وہ جگہ، ادھر ملک صاحب جو جھونپڑی میں گھس گئے تھے تو پھر باہر نکلے ہی نہیں، دل کے ذرا کمزور تھے وہ، خیر، وہاں ہم نے جوں توں کر کے رات گذاری، ایک بڑا کمرہ تھا وہ، دیواریں اور چھت لکڑی کی بنی تھیں، دروازہ تھا لیکن ٹوٹا سا، لوگ جسم پر اپنے کپڑے پہنے ہی بیٹھے رہے، رات آگئی، ایک چھوٹی سی، لیٹن جلتی رہی، مدھم سی روشنی میں، رات کی خاموشی تھی، کچھ لوگ اونگھتے رہے۔ کچھ بیٹھے بیٹھے ہی سو گئے، میں نے رات کا زیادہ حصہ جاگتے ہی گذارا۔ کیونکہ میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر کے بیٹھی ہوئی ناک والے قلی نے شام کو کہا تھا، روئی حلق سے اتارتے ہوئے برف رکنے والی نہیں بادل بہت خوفناک ہیں، میں پہلے بھی دو بار برف کے اس طوفان میں گھر چکا ہوں، دونوں بار دستگیر کی مہربانی نہ ہوتی تو میری لاش کا بھی پتہ نہ چلتا" قلی کے یہ الفاظ میرے ذہن میں چکر کاٹ رہے تھے، طبیعت گھبرا رہی تھی اور نہ جانے کتنے اندیشے کتنے خوف دل کو پریشان کر رہے تھے، صبح ہوئی تو ہماری ساری امیدیں خاک میں مل گئیں ——"

"کیا ہوا؟"

"ہوا یہ کہ ہر طرف برف ہی برف تھی، برف کے پہاڑ، ہم ایک قدم بھی ہٹ سے باہر نہ نکال سکے، دن بھر اندر دبکے بیٹھے رہے، اور بھگوان

کو یاد کرتے رہے۔ ملک صاحب تو خوف و ہراس سے زرد پڑ گئے عجیب بات ہے، کہ کچھ لوگ، موت سے پہلے ہی مر جاتے ہیں، بزدل اور مجھے ایسے لوگ ناپسند ہیں، اچھا تو میں کہہ رہا تھا کہ صبح کو برف کا طوفان دیکھ کر ہمارا دل ڈوب ڈوب گیا، وہ دن بھی بیٹھے بیٹھے ہی گذر گیا، اور دوسری رات بھی اسی برف خانے میں گذری، اور پھر دو دن اور وہیں گذرے ـــــــ چوتھے دن تو ہم نے چوبیس گھنٹے گذارے صرف دو روٹیوں پر، ہمارے پاس اب بہت کم روٹیاں رہ گئیں تھیں، اور وہ بھی باسی اور سکڑی ہوئی، سڑی ہوئی زیادہ سے زیادہ ایک دو دن اور نکل سکتے تھے، لیکن اگر برف برابر گرتی رہی تو کیا ہوگا۔ اسی غم میں ہماری جان سوکھ گئی ـــــــ اور چوتھے دن کیا ہوا ـــــــ کچھ نہ پوچھیے ـــــــ وہ قیامت تھی، قیامت ـــــــ کیا قیامت اس سے بڑھ کر ہوگی؟ اب بھی یاد کر کے میرا جسم کانپنے لگتا ہے۔ سنیے آپ کو کیا ہوا ـــــــ؟

"کیا ہوا؟" سب سے پہلے اسمال جو ڈرائی کلینر کی آواز آئی، پتلی سی حیرت زدہ آواز!

"نصف رات کا سمے تھا، ساری رات ہم جاگتے رہے، وہ رات سرد تھی، سرد، ویران، خوفناک ـــــــ جھونپڑی کی چھت ایک جگہ برف کے منوں بوجھ سے جھک گئی تھی، باہر برفیلی ہوا شائیں شائیں کرتی چل رہی تھی سب چپ چاپ تھے، میں کمرے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ٹانگیں سمیٹے بیٹھا تھا، کمرے کے بیچ میں ملک صاحب بیٹھے تھے اور دو قلی ان کے پاؤں دباتے دباتے سو گئے تھے، ان کے سر دائیں بائیں لٹک رہے تھے، دروازے کے قریب وہ دبلا، لمبا والا قلی بیٹھا تھا، کسی گہری سوچ میں غرق، اور

اور اس کے قریب ہی ایک اور قلی بھی جاگ رہا تھا، اور رہ رہ کر اللہ کو یاد کر رہا تھا۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی، مدھم سی روشنی تھی ——— اتنے میں ایک دھماکہ ہوا، قیامت کا شور، جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا ہو میں اٹھ کھڑا ہوا، اور دروازے پر دبی ہوئی ناک والا قلی دروازے کی طرف لپکا، اس کے منہ سے چیخ نکلی، اور وہ چلانے لگا ——— برف کا پہاڑ آرہا ہے۔ برف کا سمندر، موت، ہم بھاگے نہیں تو مر جائیں گے۔ بھاگو، بھاگو جان بچاؤ، یہ کہہ کر اس نے دائیں بائیں پڑی ہوئی ایک دو بیڑ ول پر ہاتھ مارا، اور بھاگنے لگا، دوسرا قلی جو اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا، اس کے پیچھے ہی دوڑا۔

"ٹھہرو، کہاں جاتے ہو، ——— کیا ہوا؟" میں چیخا۔

میری چیخ سے پہلے ہی ملک صاحب اور دوسرے سب لوگ ہڑبڑا کر جاگے تھے، اور بدحواس تھے، وہ دونوں قلی رات کے طوفان میں گم ہو گئے، اور میں جو جلدی سے ڈرتے ہوئے دروازے پر آیا تو پتہ ہے میں نے کیا دیکھا ——— میں نے دیکھا برف رک گئی ہے۔ لیکن سامنے کی بلند چوٹی سے برف کا ایک سمندر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نیچے آرہا ہے، بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ———"

"برف کا سمندر؟"

"ہاں برف کا سمندر ——— برف کی موٹی تہیں اکھڑ کر نیچے آرہی تھیں، بہت تیزی کے ساتھ، ہماری جھونپڑی سے قریباً دو میل تک اس کا پھیلاؤ تھا، اگر اس کا پھیلاؤ اور بڑھ گیا ——— خوف سے میں تھر تھر کانپنے لگا، اس کا پھیلاؤ بڑھ رہا تھا۔ بڑھتا

جا رہا تھا!

——— میں نے دروازہ بند کیا، اندر لپکا، وہاں سب دہشت اور خوف سے نیم جان ہو رہے تھے ——— شور بڑھتا چلا جا رہا تھا جیسے بموں کے مسلسل دھماکے ہو رہے تھے، ملک صاحب خدا اور رسول کو یاد کر رہے تھے، قلی رونے لگے سبھوں کے جسم لرزنے لگے، یہ موت کی کپکپی تھی، اور فوراً ہم بھی اس برف کے سمندر کی زد میں آ گئے، جھونپڑی پر جیسے برف کا پہاڑ آ گرا۔ چھت دھڑام سے نیچے آ گئی ایک چیخ میرے حلق سے نکل گئی اور جیسے میں بہرہ ہو گیا، میں سمجھا کہ میری موت آ گئی، لیکن مجھے محسوس ہوا کہ میں زندہ ہوں۔ میرے حواس قائم ہیں، میں نے دیکھا کہ جہاں میں کھڑا ہوں وہاں میرے ساتھ ہی دو قلی اور بھی کھڑے ہیں، انہوں نے مجھے پکارا، ان کی سانس بھی چلتی ہے پتہ نہیں کہاں سے اتنی ہوا آ رہی تھی، کہ ہم سانس لے سکیں، ہم اس دیوار کے ساتھ چمٹے رہے اور باقی سارا کمرہ برف کے پہاڑ کے نیچے دب چکا تھا، پنڈ چیخوں کے سوا میں دوسرے لوگوں کی اور کوئی آواز نہ سن سکا میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ سب دب گئے ہیں برف کے نیچے ——— ہم دو آدمی جہاں تھے، وہیں کھڑے رہے۔ چپ چاپ اندھیرے میں، ہم ایک انچ بھی آگے پیچھے نکل نہیں سکتے تھے، اب ہمارے چاروں طرف برف ہی برف تھی [illegible] سردی سے [illegible] ایک طویل عرصہ گزر گیا، ہماری موت اب یقینی تھی لیکن پھر بھی ہم نہ معلوم کس طرح سانس لے رہے تھے، ہر وقت مرنے [illegible] رہے، پھر ٹھٹھکتے رہے، لیکن ہماری آواز برف کی اس قید کی [illegible]

رہ جاتی، ایک دو بار قلیوں نے اور میں نے برف کی دیوار کو کھرچنا چاہا لیکن پہاڑوں کو یخ بستہ اور بے جان انگلیوں سے کون کھرچ سکتا ہے ہم موت کے قریب تھے، پھر بھی دل کے کسی کونے میں بھگوان کی یاد کی ایک کرن چمکتی رہی، لیکن کب تک؟ آخر یہ کرن بجھنے لگی، پھوڑ سے ہماری جان نکلی جا رہی تھی، آنکھوں سے بینائی کم ہوتی جا رہی تھی، ویسے بھی نہیں وہاں برف کے سوا اور کچھ سوجھائی نہیں دیتا تھا، سردی سے ہمارا جسم برف ہو چکا تھا، اب رگوں میں خون منجمد ہونے والا تھا، میں اب موت کے بالکل قریب تھا، مجھے محسوس ہوا کہ میں اب دوسرے لمحے ٹھٹھر کر مر جاؤں گا، میرے دل کی حالت نہ پوچھیے اس لمحے ـــــ ایک لمحے جب انسان کو پورا احساس ہو کہ وہ زندگی کی آخری سانس لے رہا ہے، اور دوسرے لمحے ـــــ میں چکرا کر گرنے ہی والا تھا کہ اسی لمحے دور سے... آواز آئی مبہم سی آواز، جیسے کدالوں اور کلہاڑوں سے برف کاٹی جا رہی ہے ـــــ امید بھی کیا چیز ہے، میں نئے سرے سے جی اٹھا، ہم تینوں خوشی سے چیخ اٹھے، یہ آواز برابر آتی رہی ـــــ ایک طویل وقفے تک یہاں تک کہ یہ آواز واضح ہوتی گئی، ہم اب برابر چیخنے لگے، مدد کے لئے پکارنے لگے، اور پھر تھوڑی ہی دیر میں دائیں طرف برف میں روشنی کی ایک لکیر پھوٹنے لگی، یہ لکیر بڑھتی گئی ـــــ اور پھر ہم نے.... انسانی آوازیں سنیں، بھگوان تیری دیا ہے، تیرے کام نرالے ہوتے ہیں، آخر ہم اسی سرنگ سے وہاں سے نکلے ـــــ"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ" انور صاحب پکارے،

"نئی زندگی ملی ہے آپ کو ـــــ" اسمٰعیل جو نے گہری سانس لی

"دوسرے لوگ، اور وہ ملک صاحب ____" پریم ناتھ نے پوچھا

"وہ تو پہلے ہی دب کر مر چکے تھے،"

"اور یہ لوگ کون تھے ____"

"یہ گمریز سے آئے تھے ملٹری والے ہماری مدد کو، اور وہ دبی ہوئی ناک والا قلی بھی ان کے ساتھ تھا، بہت سے لوگ تھے۔ ساز و سامان لے کر،

ہمیں پتہ چلا کہ ہم دو دن برف کی اس قبر میں زندہ رہے ہیں، برف رک چکی تھی، دھوپ نکل چکی تھی، اور راستہ بن چکا تھا ____"

ہم ڈاکخانے سے آگے کنٹرول ڈیپو کی دکان کے سامنے قطار باندھے کھڑے تھے، ایک لمبی قطار بن گئی تھی، قطار میں ہندو، مسلمان سکھ سب ہی کھڑے تھے، اور سب اپنی اپنی باری کے منتظر تھے، یہ سب لوگ وہ مسافر تھے، جو آج اتنے دنوں سے یہاں رکے پڑے تھے۔ دکان والے بے دردی سے ان مجبور مسافروں کو لوٹ رہے تھے، اور جب بہت سے مسافروں نے مقامی افسروں سے اس کی شکایت کی، جو شیلا نوجوان نوروز کسی نہ کسی مقامی افسر کے پاس پہونچ جاتا اور کوئی نہ کوئی شکایت کر بیٹھتا تھا، کول صاحب نے بھی وائرلیس کے ذریعہ دو تین بار ڈائری بھیج دی تھی، اور یہاں پھنسے ہوئے لوگوں کی مشکلات اور مصیبتوں کا ذکر کیا تھا، نتیجے کے طور پر آج سے کنٹرول ریٹ پر چاول مل رہے تھے،

میرے آگے انور صاحب کھڑے تھے، اور میرے پیچھے ہمار چند آنند جو اور ان کے بعد اسماعیل جو ڈرائی کلینر اور غلام محمد دونوں تھے انور صاحب کے آگے دس پندرہ آدمی تھے،

ایک ایک آدمی آدھ سیر چاول لے لیتا، اور ہم ایک ایک قدم آگے کو سرک جاتے اتفاق سے ہم نے کل فیصلہ کیا تھا کہ ل کے ساتھ والے کمرے میں ٹھہرے ہوئے خانصاحب سے سٹوو لے کر خود ہی

کھانا پکائیں گے، اور چائے تیار کریں گے، آج صبح سے ہم نے اس پر عمل درآمد کیا تھا، ہم نے صبح ہی صبح کشمیری چائے پی تھی، اور مدت کے بعد ہم کو اس کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ اور ہم اس کو چٹخارے لے کر پیتے رہے،

یہ فیصلہ یوں ہوا تھا کہ کل اسماعیل جو ڈرائی کلینر کو اچانک یہ خیال آگیا تھا جب کہ میں اور انور صاحب بھی، ہم تینوں، خانصاحب کے کمرے میں بیٹھے تھے، خانصاحب کے بارے میں شاید میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے کاروباری آدمی ہیں یہ —— خاصے دولت مند نظر آتے ہیں، ایک تو بڑے خانصاحب ہیں، قراقلی ٹوپی پہنے ہوئے، پشمینے کے قیمتی کپڑوں میں ملبوس، اور ایک جلالی دوشالہ اوڑھے ہوئے، اور دو چھوٹے خانصاحب —— دونوں ان کے چھوٹے بھائی ہیں، شکل وصورت سے تینوں خطرناک حد تک ملتے ہیں، اور ایک ڈرائیور ہے ان کے ساتھ، جو بازار سے سودا سلف لاتا ہے اور ان کے لئے کھانا پکاتا ہے ——

بات چلی کمر توڑ گرانی کی، جو ان دنوں وہاں عام تھی، لیکن پھر بھی اس بات پر سب ہی متفق ہوئے کہ ہوٹلوں اور دکانوں میں کھانے کے بجائے خود پکانے میں فائدہ ہے، اور ڈرائی کلینر نے کہدیا کہ کیوں نہ ہم بھی خود ہی پکائیں، اسٹوو خانصاحب سے لیتے رہیں گے ——"

"ضرور لیجئے، ہمارے پاس دو اسٹوو ہیں، آخر مصرف تو لینا ہے ان سے —— آپ کے ہاتھ کس نے روکے ہیں، —— بڑے خانصاحب نے تکیہ سے ٹیک لگاکر، اور حقہ کا کش لے کر کہا۔

کمرے کے ایک طرف بڑی دری بچھی ہوئی تھی، جس پر ایک چھوٹا سا

کشمیری قالین بچھا ہوا تھا' اور خالصاحب پوری شان اور ٹھاٹھ سے اس پر براجمان تھے' کمرے کے دوسری طرف سٹوو جل رہا تھا اور کچھ برتن بکھرے پڑے تھے'

اور جب انور صاحب نے اس کا ذکر حال میں غلام محمد سے کیا. تو غلام محمد نے کہا کہ وہ بھی تیار ہے' اس طرح کم خرچہ پڑے گا' پکانے کا کام اس کی بیوی کرے گی' اور غلام محمد نے راز داری سے کہا۔

"آپ میرے بھائی ہیں' اپنی مجبوری بس آپ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں سفر کا معاملہ ہے' بڑی مصیبت ہے' جموں میں تو میرے بھائی کا ہوٹل ہے۔ وہاں میں چاہوں تو سینکڑوں روپے ——"

"بھائی صاحب آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میں —— میں ——"

"دیکھیے ہم چاہتے ہیں کہ ہم مل کر یہیں کھانا پکائیں گے' جس طرح یہ پنڈت لوگ پکار ہے ہیں' اسی طرح کم خرچ پڑے گا اور کھانے میں گھر کا لطف آئے گا' ہوٹل کے کھانے نے تو ستیاناس کر دیا' اور وہاں ملتا ہی کیا ہے کھانے کو —— ہم لوگ برابر کا پیسہ لگائیں گے ——"

"یہی تو میں کہنے والا ہوں آپ سے —— غلام محمد کے لہجے میں پھر وہی عاجزی بے بسی اور درد آ گیا' اس کے چہرے پر پسینے آ گئے اور بے بسی کی لکیریں تن گئیں'

اور ہم تینوں سنتے رہے۔

"میں جب چلا تھا' تو بھائی صاحب سے بیس پچیس روپے لایا تھا

میرا خیال تھا کہ دن بھر ہی کا سفر ہے۔ اور اب تو میرا سارا پیسہ ختم ہونے کو آیا۔ چند روپے رہ گئے ہیں، آپ خرچ کیجئے، اور جو پیسہ میرے نام رہے گا، میں ——— میں پائی پائی ادا کر دوں گا ——— آپ لوگ بے فکر رہئے میں سارا کام کر دوں گا، سودا سلف لاؤں گا بازار سے اور میری بیوی پکائے گی، آپ ———"

میں بے چین ہو گیا۔ اور بے بسی سے اس کے مجبور چہرے کو دیکھنے لگا۔ چند روز کے بعد میرے سامنے بھی ایسا ہی کوئی مسئلہ آ رہا تھا، یا اللہ میں کیا کروں؟

"آپ بے فکر رہئے، پیسہ فی الحال میں خرچ کر رہا ہوں، میرے پاس ابھی روپیہ ہے"،

انور صاحب خلوص کے جذبات میں بہہ نکلے، شاعر جو ٹھہرے غلام محمد کی بات ان کے دل میں بیٹھ گئی تھی اور وہ کہہ رہے تھے۔ آپ ہمارے بھائی ہیں، ممکن ہے ہم ہی آپ کی پوزیشن میں ہوتے غلام محمد یہ سن کر خوش ہو گیا۔ اس کے کئی روز کے بڑھے ہوئے شیو والے چہرے پر ایک رونق آ گئی، اس کی بیوی بنچ پر بیٹھی ہماری گفتگو سن رہی تھی، اس کی دراز ریشمی پلکیں اس کی چشم غزالاں پر سایہ فگن تھیں۔

دوسرے لمحے طے ہوا کہ دوسرے روز سے ہم اپنا کھانا بنائیں گے اور انور صاحب نے سودا سلف کی فہرست تیار کی۔ اور غلام محمد کو مناسب ہدایات دیں۔

آج صبح ہم نے گرم گرم، خوشبو دار اور سرخی

مائل کشمیری نمکین چائے پی لی تھی، غلام محمد کی بیوی نے ہمارے سامنے بڑی فنکاری سے یہ چائے بنائی اور جب چائے کے لئے سٹوو پر پانی گرم ہو رہا تھا، تو ـــــ تو ہال میں دو آدمی داخل ہوئے اس وقت وہ دو ہی آدمی تھے ہیرانی نیلام پر خریدی ہوئی ملڑی چیسٹر پہنے ہوئے، الجھے الجھے بال، اور شالوں پر پہلے سے تولئے رکھے ہوئے وہ اندر آگئے، دانتوں کو دانتوں سے رگڑتے ہوئے وہ باتھ روم میں جانا چاہتے تھے، ایک آدمی باتھ روم گیا اور دوسرا انور صاحب کی بنچی کے کنارے بیٹھ گیا۔

ہم سب خاموش رہے، غصہ سے ہمارا خون کھول رہا تھا۔ لیکن ہم خاموش تھے، یہ ہماری پالیسی تھی، اور اس پر چلنا ضروری تھا، غلام محمد ان کو نظر انداز کر کے کام میں مصروف رہا۔ اس کی بیوی گھبرائی گھبرائی سی کام میں مصروف رہی، سمار چند کی بھوئیں تن گئیں اور وہ لگاتار پلکیں جھپکاتے رہے اور آنند جو مذہبی کتاب میں ڈوب گئے تھے

"جب ہم طواف کر رہے تھے ـــــ" انور صاحب نے ایک منبر پر چڑھے ہوئے واعظ کی طرح وضاحت اور مذہبی جوش کے ساتھ کہنا شروع کیا، ـــــ ہم طواف کر رہے تھے، خانہ کعبہ میں۔ خدا کے گھر، ہم کا گھر، جل شانہٗ ـــــ اور ہم سب لوگ، خدا تعالیٰ کی ذات بے مثال میں گم ہو کر پڑھ رہے تھے ـــــ لبیک لبیک لا شریک لہ، لبیک ـــــ"

"سبحان اللہ! ـــــ اسماعیل جو ڈرائی کلینر کی پتلی سی آواز تھرائی"۔

طواف کے بعد آپ نے روضہ پاک کی زیارت کی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"جب ہم روضۂ پاک کے قریب پہنچے (صلی اللہ علیہ وسلم)" انور صاحب حج کی تفصیلات پوری جزئیات کے ساتھ بیان کر رہے تھے اور وہ دونوں آوارہ گرد کچھ دیر ہمارے چہروں کو بیزاری سے تکتے رہے۔ ہونٹ چباتے رہے، جماہیاں لیتے رہے ——— اور پھر اٹھ کر چلے گئے!

ہمارا ڈرامہ معمول کی طرح کامیاب رہا تھا، انور صاحب کی کارروائی تو لاجواب تھی!

"کیا نام ہے آپ کا ———؟ اچانک دکاندار کی آواز نے مجھے چونکا دیا

"جی ——— محمد رفیق ———! میں نے خیالوں کے ریلے کو روک دیا۔

اور میں نے پیسے دے کر آدھ سیر چاول حاصل کیا۔ ہم خوشی خوشی چاول لے کر چل رہے تھے، انور صاحب ہمارے رہنما تھے، چلتے چلتے وہ ہمیں ایک سبزی کی دکان پر لے گئے!

"جب بھی مجھے اپنے عزیزوں اور پیاروں کی یاد آتی، میرے دل کی اداسی گہری ہو جاتی! دھڑکنیں ڈوبنے لگتیں، ایک گھٹی سی آہ میرے سینے میں دب کر رہ جاتی، اور میری سلگتی ہوئی پلکیں نم آلود ہو جاتیں ——!"

ایسی کیفیت بار بار مجھ پر گذرتی، اور بار بار میں اپنی بے بسی پر کڑھتا۔ اس وقت بھی، جبکہ میں ہال میں بیٹھا تھا، سب بیٹھے تھے، باتیں ہو رہی تھیں۔ آشا بوڑھی نانی کی باتوں پر ہنس رہی تھی، اور وہ پوپلے منہ سے اُسے کانگڑی واپس کرنے کو کہہ رہی تھی، اسمار چند ایک پنساری سے جھگڑے کی داستان بیان کر رہا تھا۔ اور آنند جو کسی مذہبی کتاب کے اشلوک گنگنا رہے تھے، ادھر غلام محمد اور اس کی بیوی اور اسمال جو ڈرائی کلینر تینوں برتنوں میں چاول لئے ہوئے اسے صاف کرنے میں منہمک تھے، اور انور صاحب چہرے پر فکر و خیال کی پرچھائیاں لئے ہوئے فکر سخن میں غرق تھے، اور میں کتاب پڑھتے ہوئے اس محدود دنیا کی وسعتوں میں کھو رہا تھا۔

—— ایک عجیب ماحول تھا۔ زندگی کی ایک عجیب تصویر، تصویر کا ایک پہلو جو زندگی کی پوری ہنگامہ آرائیوں، مصروفیتوں، چھوٹی چھوٹی خوشیوں، انسانی برادری اور اس کے تعلقات، جذبات

اور احساسات اور اس کی دلچسپیوں کی عکاسی کر رہا تھا!
زندگی سمٹ کر ارتقا کی اس منزل پر آ گئی تھی، جو ماضی کے گہرے اندھیروں میں گم ہو چکی تھی، ارتقا کی وہ اولین منزل، جب انسان انسان بن کر رہے گا۔ ایک ہی جگہ، ایک ہی خاندان میں یہی وہ منزل تھی، اور پھر سمٹے ہوئے فاصلے پھیل گئے۔ ہٹتے گئے، پھیلتے گئے، بکھرتے گئے، —— خاندان ہو گئے —— اور زندگی بے کراں —— بے کراں لامحدود!!

اتنے میں کول صاحب آ گئے، اور انہوں نے پہلی منحوس خبر یہ سنائی کہ پھر برف کا طوفان آ رہا ہے۔

برف کا طوفان ——!!

جو جس جگہ بیٹھا تھا، جس کام میں مصروف تھا، وہیں ساکت ہو کر رہ گیا۔

سبھوں کے چہرے بجھ کر رہ گئے!!

کول صاحب بیٹھے، وہ آج خلاف معمول!! زیادہ ہی بجھے بجھے سے تھے،

ان کی موٹی موٹی باہر کو نکلتی ہوئی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے گہرے ہو گئے تھے! ——"

میں ان بجھے بجھے، افسردہ و مجبور لوگوں کے چہروں کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ یہ چہرے راکھ ہو چکے تھے، —— میں اٹھ کر باہر چلا آیا —— برآمدے پر مکمل خاموشی تھی، ویران خاموشی سامنے مختصر پارک میں برف کے بڑے بڑے تودے جمع ہو گئے

تھے، سفید، اجلی اجلی برف، بے داغ، تقدس آمیز پارک کے آگے گہری کھائیاں تھیں، بے شمار کھڈ تھے، اونچائیاں تھیں، جن پر برف کے غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ اور کھائیوں اور انچائیوں پر اَنگنت درخت کھڑے تھے، برف کا لباس پہنے ہوئے، خاموش اور بے حسی وحرکت درخت، اور پھر پہاڑوں کے بے شمار سلسلے تھے، برف پوش، پُر وقار، عظیم ——!

اور برف کی عظیم چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں ان چوٹیوں کا دماغ آج آسمان پر تھا، —— ان کا غرور بلندیوں پر تھا، ! جیسے یہ چوٹیاں آسمان سے سازش کر رہی تھیں اور آسمان کی دھندلائی بے کراں وسعتوں میں برف کا ایک سیلاب امنڈا آرہا تھا —— یہ سیلاب آرہا تھا —— یہ سیلاب کہاں جاکر رُکے گا؟

یہ سیلاب کہاں جاکر رکے گا؟

میں انتہائی بے لبسی کے ساتھ، مظلومیت کے ساتھ، ان سربھرے پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو سینے پھلائے ہوئے، چہروں پر غرور و ناز لئے ہوئے اپنی مضبوط، فولادی، سنگیں بانہوں کو میلوں تک پھیلاتے ہوئے، کائنات کی دوسری تمام طاقتوں کا مضحکہ اڑا رہے تھے ——!

کائنات کی واحد قوت ——! جو گردش روزگار کا آج صدیوں سے تمسخر اڑا رہی ہے، یہ قوت بے پناہ ہے، بے کراں ہے، لازوال ہے۔ یہ ازل اور ابد کی سرحدوں کو ملاتی ہے ——

—— ازل اور ابد کی سرحدوں کو پیچھے چھوڑتی ہے!

"آپ —— آپ برف کو دیکھ رہے ہیں بابو جی —— اچانک پیچھے سے بوڑھے چوکیدار کی آواز آئی۔

"نہیں تو ——"

"میں ڈاک بنگلے سے آیا ہوں، ابھی ابھی ——"

میں اس کے جھولے سے چہرے کی میلی سی سفید مونچھوں اور سفید بھوؤں کو دیکھ رہا تھا،

"وہاں ہیں نا وہ بی بی جی ——"

"کون ——"

"وہی کماری جی ——"

"ہاں —— ہاں ——"

"بیچاری بڑی سخت بیمار ہیں ——"

"بیمار ہے وہ؟"

"جی ہاں وہ تو دو دن سے بیمار ہے، اس نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ میں اس وقت شام کو روٹی اور دال لے کر گیا، لیکن صبح جب وہاں گیا، تو وہ روٹی اور دال وہیں رکھی تھی —— اور اسے بخار تھا

اف وہ اتنی بیمار ہے، اور مجھے مطلق علم نہیں —— میرے دل میں اضطراب کی ایک تیز لہر اٹھی ——!

اور جب چوکیدار ہال کے اندر داخل ہوا، میں برف کی پروا کئے بغیر، کماری جی کے کمرے کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔

دروازے کے باہر برآمدے پر میں نے ٹوپی اور کپڑوں پر

جمع شدہ برف جھاڑ دی، اور دروازے پر دستک دی۔

"کون ——؟" نحیف سی آواز آئی۔

"میں ہوں رفیق ——"

"آ جائیے ——"

میں اندر گیا،

کماری چارپائی پر لیٹی تھی۔

اس کے سرہانے کے قریب مکسچر کی ایک بوتل تھی۔

میں اس کے بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا، سرہانے کے قریب اور وہ مجھے دیکھتی رہی۔

اس کے چہرے پر نقاہت تھی، لیکن اس کے رخساروں پر آنچ تھی

"آپ اتنی بیمار تھیں اور مجھے بالکل پتہ نہ تھا، ابھی ابھی چوکیدار نے مجھے بتایا۔ اور مجھ پر جیسے بجلی گر پڑی میں دوڑتا دوڑتا آیا"۔

وہ اب بھی مجھے خاموش نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، لیکن ان خاموش نگاہوں میں کتنے محشر پل رہے تھے! آپکو کیا تکلیف تھی!

"تکلیف وہ دھیرے سے مسکرائی، بیماری اور نقاہت سے اس کے ہونٹوں کا سبزہ خط اور نکھر آیا تھا —— "پتہ نہیں مجھے کیا ہوا —— اس دن جب آپ آئے تھے میرے جسم سے سردی کی لہریں اٹھ رہی تھیں —— اور جب آپ چلے گئے میرا سارا جسم کپکپانے لگا، اور پھر رات کو بخار ——"

"اچھا پھر ——" میرا دل ایک انجانے درد سے لبریز ہو گیا تھا۔

"پھر دو دن بخار رہا —— چوکیدار نے ایک کمپونڈر کو لایا،

ڈاکٹر بلا ہی نہیں کوئی، اتنی برف میں کون آتا ——— ہاور جب سے بکسچر اور ٹکیاں لے رہی ہوں، ——— آج کچھ اچھی ہوں، میرا خیال تھا آپ ضرور آئیں گے، لیکن آپ نہ آئے، اور میں کتنا روتی رہی، آپ کے یہ دوست انجیر صاحب ہیں نا! انہوں نے بھول کر بھی یہاں قدم نہ رکھا ——— چوکیدار نے کہا، وہ تو ایکسیڈنٹ کے بعد گھر سے نکلتے ہی نہیں، ——— لیکن آپ سے تو مجھے ایسی توقع نہ تھی، ———،

اس کی آنکھوں کی گہرائیوں سے کئی سلگتے ہوئے موتی ابھر آئے اور میں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

میرے گونگے ہونٹ کانپتے رہے۔

میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے ریشمی ڈوپٹے کے پلو سے اس کی آنکھیں صاف کیں، اور اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

اور وہ کہہ رہی تھی۔ آنسوؤں میں بھیگے ہوئے لہجے کے ساتھ!

" آپ کو نہیں معلوم، میری زندگی میں کتنے گھاؤ ہیں ——— یہ گھاؤ اب ناسور بن چکے ہیں ——— میں تڑپتی ہوں، تلملاتی ہوں روتی ہوں ——— لیکن ——— اور پھر میری ویران تنہائیاں مجھے ڈستی ہیں میں چیختی ہوں ——— میری چیخیں سینے میں گھٹ گھٹ کر رہ جاتی ہیں ——— میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے، میں ہر وقت غلط سمجھی گئی ——— اور اب میں مر جانا چاہتی ہوں ——— میں سچ مچ مر جانا چاہتی ہوں، ——— میں ——— "

اور آنسو اس کے تپتے ہوئے رخساروں سے بہتے رہے۔

وہ سسکتی رہی۔
کتنے لمحے سسکتے رہے!!
اور میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں پرنم ہو چکی ہیں!!

●

وہ بہت ہی بھیانک رات تھی!

تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی رات ——— اتنی تاریک رات شاید آج تک اس دھرتی پر نہیں اتر آئی تھی ——— تاریکیوں کا ایک امنڈتا ہوا سمندر، تاریکیوں کے پہاڑ ——— برف کی سفیدی گم ہو چکی تھی اور سرد، یخ بستہ برفیلی ہوا کے شدید جھکڑ یوں چل رہے تھے، جیسے وہ پاگل ہو گئے ہوں ———!

کیا یہ رات بھی پاگل ہو چکی تھی؟

کیا تاریکیوں کا دیوتا بھی انسانوں کی اس مٹھی بھر جماعت کے خلاف اپنی ساری تاریک اور خبیث قوتوں کو آج ہی آزمانے پر تلا ہوا تھا؟

دیوتا بپھر چکا تھا!

رات کی سیاہ وادیوں میں گھٹن تھی، ———!

یہ وادیاں نہیں، قبرستان ہیں منہ کھولے ہوئے، جہاں حیات سوتی ہے اور موت جاگتی ہے، جہاں ہر طرف موت کا اقتدار ہے!

کیا اس رات کی کبھی سحر ہو گی؟

کیا وہ دن کبھی آئے گا جب یہ اندھیرے سمٹ کر کافور ہو جائیں گے؟ کیا پھر کبھی سحر کی پہلی کرن برف پوش چوٹیوں پر مسکرائے گی؟

میں برآمدے کے کنارے، چھت سے لگے ہوئے ستون کے سہارے

کھڑا تھا۔

سردی سے میری جان نکل رہی تھی' لیکن میں اس وقت تک یہیں کھڑا رہنا چاہتا تھا' جب تک کہ پریم ناتھ اور اس کی بیوی بچے خیریت سے نہ آجائیں۔

وہ ابھی تک نہیں آئے۔

وہ کب تک آجائیں گے؟

ایک ایک لمحہ پہاڑ بن رہا تھا ——— !

کچھ دیر پہلے جب کہ میں ہال سے باہر نکلا' محض یہ دیکھنے کے لئے کہ موسم کیسا ہے میں دروازے سے باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے سے پریم ناتھ آتا دکھائی دیا۔

پریم ناتھ کئی روز کے بعد نظر آیا تھا۔

وہ ہانپ رہا تھا' اس کی حالت پاگلوں جیسی تھی!

"کیوں بھئی خیریت ہے نا؟"

وہ رک گیا۔

اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"میں آپ ہی کے پاس آرہا تھا ——— یہ پوچھنے کے لئے کہ آیا ہال میں کوئی بنچ بھی خالی ہے؟"

"ہاں' ہاں یہاں تو وہ آپ کی بنچ خالی ہی ہے ——— کیوں کیا بات ہے؟"

"میں بچوں کے سمیت یہاں آنا چاہتا ہوں ———"

"ضرور آجایئے' چشم ما روشن ———"

"ابھی آرہا ہوں، میں بچوں کو لاؤں گا —— وہ بازار میں سرداری کی دوکان پر ہیں۔ میں وہیں ٹھہرنے والا تھا، لیکن سوچا پہلے یہاں دیکھ آؤں ——"

"لیکن اتنی رات گئے —— ای قصہ ——"

"بھئی قسمت ہی خراب ہے میری ۔ سچ ہے مصیبت جب آتی ہے، اکیلی نہیں آتی ——"

اس نے لمبی آہ کھینچ کر کہا۔

"کیوں، خدانخواستہ ——"

"میرا اس ہیڈ کلرک کے بچے سے جھگڑا ہو گیا۔"

"وہی جس کے پاس آپ ٹھہرے تھے؟"

"ہاں —— ہاں —— میں نے پہلے ہی دن نہیں مانا تھا، لیکن میری وائف نے ضد کی، وہ اس کی بیوی کو جانتی ہے۔ سہیلی ہے اس کی —— اور جب ہم پہلے دن اس کے ڈیرے پر گئے، تو مجھے اس کی بیوی نیک اور شریف دکھائی دی، لیکن جب اس کا خاوند آفس سے آگیا، تو میں پہلی ہی نظر میں اسے دیکھ کر بے چین ہوا، اچھا آدمی نہیں لگا مجھے، —— لیکن میں مجبور ہو گیا —— اور اس کی بیوی نے اس وقت ہمارے لئے کمرہ خالی کر دیا تھا، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نوکر کو سامان لانے کے لئے کہا —— سچ کہو میں مجبور ہو گیا ادھر سے جیب میں پیسے بھی کم تھے، میں نے سوچا، پتہ نہیں کتنے دن لگیں گے، —— اور ہم وہاں رہے، میں نے وائف سے کہہ دیا ہم اپنا کھانا الگ پکائیں گے، یہ کب تک ہمارا بوجھ اٹھائیں گے۔

لیکن والف نہیں مانی، اور ادھر سے وہ لوگ بھی ضد کرتے رہے کہ ہم لوگوں کے چند روز ان کے ساتھ کھانے سے کونسی کمی ہوگی، میں مجبور ہو گیا ——— یہ مجبوری بھی کتنی مصیبت ہے ——— اور پھر اتنے دن ہم وہاں رہے ———" وہ رک گیا اور اس نے آہ کھینچی۔

"پھر کیا ہوا ———"

"وہی تو بتاؤں گا۔ آپ سے کہنے میں کوئی شرم نہیں، آپ میرے کلاس فیلو رہے ہیں، حالانکہ آپ کو یاد نہیں، میں نے آپ کو پہچان لیا، آپ میرے بھائی ہیں لیکن غیر کو بتاتے ہیں ———"

"بھئی آپ سمجھئے گا ———

"بات یہ ہے کہ وہ ہیڈ کلرک کا بچہ بڑا بدمعاش نکلا ——— میں سمجھ گیا تھا کہ یہ شیطان کا بچہ میری والف سے خوامخواہ بھی بھی باتیں کرنے کا موقعہ ڈھونڈتا رہتا ہے۔ میں نے والف سے ایک بار کہا، لیکن وہ بولی ایسی کوئی بات نہیں، یہ وہم ہے ——— لیکن آج جبکہ میں شام کے بعد ان کے ڈیرے پر آرہا تھا، مگر میں ادھر چلا آیا، تو میں نے دیکھا کہ یہ کمینہ میری والف پر دست درازی کر رہا تھا ——— پھر آپ کچھ نہ پوچھئے میں نے ایسی خبر لی اس کمینے کی کہ عمر بھر یاد رکھے گا ——— اس کی بیوی بھی اسے کوستی رہی میں اسی وقت وہاں سے چلا آیا، میری غیرت کب مجھے اجازت دیتی کہ میں اس کمینہ کے گھر میں رہوں ہم چلے آئے حالانکہ اس کی بیوی نے لاکھ ہمیں روکنا چاہا ———"

آپ نے اچھا کیا، بہت اچھا کیا ــــــ آپ فوراً چلے آیئے میں آپ کے لیے منجی منگوا دوں گا ــــــ"

اس حادثے کو سن کر میں دھک سے رہ گیا تھا!

اور رات کی ٹھٹھرتی ہوئی تاریکیوں میں برفیلی ہوا کے خوفناک جھکڑ چلتے رہے ــــــ"

وہ اندھیروں میں غائب ہو گیا اور میں برآمدے کے کنارے اس ستون سے لگ کر اس کا انتظار کرنے لگا ــــــ

یہ انتظار اب بھی تھا۔

میں نے ہال میں سبھوں کو کہا کہ پریم ناتھ بیوی بچوں سمیت آ رہا تھا، غلام محمد نے فوراً منجی لگا دی ــــــ اور میں پھر باہر نکلا، شاید وہ آ رہے ہوں گے۔

رات کی تاریکیوں میں بے شمار روحیں چیخ رہی تھیں!!

میں سردار جی اور پریم کمار سے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد دین محمد کی دکان کی طرف جانے لگا. میرے دائیں ہاتھ میں ایک برتن تھا' جس میں دین محمد سے دودھ لانا تھا' جب سے ہم نے کھانا پکانے کا انتظام کیا تھا' خود' میرے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا تھا' ہر روز کشمیری چائے کے لئے دین محمد سے دودھ لایا کرتا میں اس وقت بھی دودھ لانے جا رہا تھا' کہ پریم کمار اور سردار جی سے ملاقات ہوئی' دونوں حسب عادت سردی کی شدت کی شکایت کرتے رہے' اور آج پریم کمار بار بار کہتے رہے' کہ جموں کا راستہ کھل جائے پھر وہ واپس لکھنؤ چلے جائیں گے' انہیں اب سرینگر جانے کی ہمت نہ رہی تھی' اور وہ خود ہی کہتے رہے یہ سیزن نہیں وادی میں جانے کا' اور پھر یہ روڈ تو HOPE[illegible] ہے صاحب' سردار جی تو صرف قسمت کی خرابی کی بات کرتے رہے میں ان سے نمٹ کر آگے چلا آیا'

دین محمد کی دکان پر محفل جمی ہوئی تھی۔ سب بیٹھے تھے' ___ شاہ جی چلم کے کش بھی لگاتے اور بھیانک قہقہے بھی' ڈیلدار اور گالیاں بکنے والا ڈرائیور حیدر ملک دونوں شاہ جی کے پیر زبار ہے تھے' اجو شیلا نوجوان سگریٹ پھونک رہا تھا' اور

خواجہ صاحب اکڑوں بیٹھے دین محمد سے الجھے ہوئے تھے،

"کل بھی چاول ابلے ہوئے نہ تھے، کچے چاول کھلا دیئے، اور رات بھر پیٹ میں درد رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا میں نے پہلے ہی دن کہا تھا ہم سے پیسے زیادہ بیشک لیجئے لیکن کھانا ٹھیک کھلا دیجئے پھر آپ کی ایمانداری پر مجھے بھروسہ تھا"

خواجہ صاحب غصہ اور بیزاری سے کہہ رہے تھے،

"میں نے کہا، اگر میں نے بھی بے ایمانی کی تو کونسا گناہ کیا خواجہ صاحب"
دین محمد گھی پر تلا ہوا پراٹھا بنا رہے تھے، — "کون ہے آجکل جو ایماندار ہے، اور اگر میں ایماندار رہتا تو لوگ مجھ پر سنگباری نہ کرتے — ضرور سنگباری کرتے خواجہ صاحب — اور میں لہو لہان ہو کر مر جانا نہیں چاہتا تھا — "

دین محمد کا لہجہ سخت تھا، سخت اور ترش!

"تمام منصور دار پر لٹکتے ہیں — اور موت قہقہے لگاتی ہے — "

اچانک شاہ جی کی آواز چھا گئی!

سب خاموش ہو گئے۔

شاہ جی اب خاصے مشہور ہو چکے تھے، جہاں بھی دو چار آدمی جمع ہوئے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد شاہ جی کا ذکر ضرور آتا، کل جب مسجد سے نکلتے ہوئے مجھے حاجی صاحب ملے تھے، تو انہوں نے کہا تھا کہ شاہ جی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں، صاحب کرامات ہیں، ایسے اللہ والے اب ناپید ہو گئے ہیں، چراغ لے کر ڈھونڈیئے، اب ایسے

قلندر صفت انسان نہیں ملیں گے، ہاں کوئی ملے گا آپ کو، تو انھیں پہاڑوں میں، دور افتادہ جنگلوں میں ــــــ شہروں میں نہیں وہاں تو گناہ پلتے ہیں، حرام کی کمائی ہے، وہاں دھوکہ بازی ہے، بے ایمانی ہے، چور بازاری ہے ــــــ! وہاں ایسے اللہ کے پاک بندوں کا گذر کہاں، حالانکہ ہمارے ملک میں ویسے قلندر اور درویش بہت پیدا ہوتے رہے ہیں، یہ درویشوں کا گھرانا ہے، اس لئے ایسے پیر وپیر سکتے ہیں، لیکن اب وہ زمانہ کہاں ــــــ اب تو آخری زمانہ ہے آخری زمان ــــــ کان پکڑنا چاہیئے اسی زمانے سے، اسی زمانے کے لوگوں سے ــــــ حاجی صاحب کی بات میں مجھے معقولیت نظر آئی تھی اور مجھے بھی دل ہی دل میں شاہ جی کے لئے جذبہ عقیدت پیدا ہو رہا تھا۔

اور ان دنوں شاہ جی کی سب ہی پیشین گوئیاں درست نکلی تھیں، جب ہم کرنال دکان کے سامنے لائن لگائے کھڑے تھے، تو کتنی ڈرائیوروں اور کلینروں نے شاہ جی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ شاہ جی صاحب حال بزرگ ہیں۔ ایک آدمی بیمار تھا، آپ نے کہا کہ وہ مر جائے گا، دوا دارو بے کار ہے ــــــ اور وہ آدمی فوراً مر گیا ــــــ آپ کہتے رہے کہ آسمان سے بلاؤں کا نزول ہو رہا ہے، قیامت کے آثار ہیں ــــــ ظاہر ہے کہ ابھی موسم خراب رہے گا۔ بہت سے لوگ شاہ جی کی خدمت میں گئے تھے اور رحم و کرم کے لئے منت وسماجت کی تھی، لیکن یہ قلندر لوگ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں، آسانی سے پگھلتے نہیں جاتے ــــــ!

یہ سب باتیں اس وقت بھی میرے ذہن میں منڈلا رہی تھیں

"شاہ صاحب ہم لوگ کب تک اس تکلیف میں رہیں گے؟" اچانک میری زبان کھل گئی، میرے لہجے میں عقیدت کی گرمی تھی۔

"جب تک قیامت نہیں آتی ــــــ" جواب ملا

"یہاں تو ہر لمحہ قیامت ہے، شاہ صاحب، اب اور قیامت کیا آئے گی ــــ آپ دعا کیجئے ــــــ" میں نے بھی اسی رو میں کہا ــــــ!

"کون ہو تم ــــــ! آج پہلی بار نظر آئے ہو ــــــ"

شاہ صاحب نے گھور کر مجھے دیکھا، اور قدرے برہم ہو کر کہا ــــــ

"یہی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا ہوں، ــــــ" میں اس کی وحشت خیز آنکھوں سے قدرے ڈر گیا۔

"شاہ صاحب، یہ بھی یہاں رکے پڑے ہیں ہمارے ساتھ ــــــ آتے رہتے ہیں یہاں پر ــــــ" اذیلدار نے وضاحت کی۔ دوسرے دیہاتی نے زور زور سے پیر دبانے شروع کئے، تاکہ وہ قہر پر نہ اتر آئیں۔

اور جوشیلے نوجوان نے مجھے "تکھ ماری" غالباً اس کا مطلب یہ تھا کہ ان سے زیادہ سوال جواب نہ کیجئے، کیوں سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالتے ہیں آپ!

میں نے بھی خاموشی ہی میں اپنی خیریت سمجھی۔ اور دین محمد سے برتن میں دودھ لے کر چلتا بنا۔

سب خاموش ہو گئے۔

سب اپنے اپنے خیالوں کی پرچھائیوں میں گم ہو گئے۔

اور شمعوں کی لو تھرتھراتی رہی ـــــ

یہ جلتی ہوئی، مدھم سی روشنی بکھیرتی ہوئی شمعیں کتنی تیزی سے پگھل کر رہ جاتی ہیں۔ اور روشنی کے متوالے انسان کو پتہ بھی نہیں رہتا اور شمع بھڑک کر بجھ جاتی ہے۔

انور صاحب بھی اب خاموش تھے، آج ان کی آخری غزل نے میری روح کی محراب پر بے شمار شمعیں روشن کر دی تھیں'۔

پیار کے جذبات کی آنچ اور خلوص کی روشنی سے تھرتھراتی ہوئی یہ غزل میرے دل میں اترتی چلی گئی۔ ایک ایک شعر نشتر بن گیا ـــــ زخموں کے کنول جلنے لگے'۔

اور شمعوں کی دو طرفہ قطار دل میں، سمٹتے ہوئے نرم سایوں، اور کانپتی ہوئی روشنی میں وہ آ رہی تھی، میرے خوابوں کی دلہن ـــــ دور خوابوں کی مہکتی ہوئی گلپوش وادیوں میں شہنائیوں کے ساز شگوفوں کی بارش کر رہے تھے ـــــ وہ آ رہی تھی ـــــ کبک دری کی مانند محو خرام ہر قدم میں ہزار محشرستان سنبھالے ہوئے، اس کے سیاہ ملائم بال، دو گھنی مہکتی ہوئی چوٹیوں میں، سیاہ ریشمی ڈوپٹے میں ہزار فتنے جگا رہے

تھے ـــــــــ"

اس کی نرگسی آنکھوں میں رعنائیاں تھیں، نیلے خم دار ہونٹ پر دوشیزگی کا رس، اور اس کے تپتے ہوئے عارض میں وقار جمال تھا ـــــــــ!

وہ کوئی حور تھی جنت کی محو جلوہ گری، میری رشمی، میرے خواب حیات کی تعبیر ـــــــــ اور میں بازو کھولے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگا۔

شمع اپنی روشنی تیز تر کر دو!

آج میری کائنات کا ذرہ ذرہ منور ہو رہا تھا!

میری رشمی، میری محبوبہ میری باہوں میں تھی، میں اپنے وجود کو اس کے جسم کی مہکتی ہوئی رعنائیوں میں گم کر چکا تھا ـــــــــ"

اف، یہ نشہ کا عالم!

اف! یہ برسوں کی گھٹی ہوئی محبت کا پہلا اظہار ـــــــــ!!

میرے سلگتے ہوئے ہونٹ اس کے کانپتے ہوئے رسیلے ہونٹوں سے پیوست ہو چکے تھے، امرت میرے حلق سے اتر کر میری رگ رگ میں تحلیل ہو رہا ہے میں عشق پیچاں کی بیل کی طرح اس کے جسم سے لپٹ گیا تھا، اور میں نے دیکھا اس کی آنکھوں کی سرمئی گہرائیوں میں ایک ابدی سکون پھیل رہا تھا، ایک ابدی سکون ـــــــــ!

لیکن اس کی مہکتی سانسوں میں انتشار تھا!

اور آج برسوں کے بعد میں اسے کھل کر پیار کر رہا تھا ـــــــــ

میری روح میں بے شمار کنول کھل اٹھے تھے! ـــــــــ مجھے لکھنؤ جانا تھا مزید تعلیم کے لئے، اور رشمی نے خود ہی ملاقات کا انتظام کیا تھا، بڑی دشواریوں کے بعد ـــــــــ!

یہ ملاقات زندگی کا حاصل تھی!
مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے سینے کے آتش خانوں کو شبنمی بہاروں کے خنک جھونکے گدگدا رہے ہیں ——!
جذبات کی تیز لہریں نہ جانے ہمیں کہاں بہا لے جاتیں، کہ اتنے میں زینب کمرے میں آئیں، ہمارے لئے چائے لے کر، اور ہم بوکھلا کے اٹھتے ہوئے سنبھل گئے ——!
اور پھر دیر تک زینب کی مزاحیہ باتوں پر ہم قہقہے لگاتے رہے۔ ہمارے قہقہے جنگل میں پہاڑوں سے گرتی ہوئی آبشاروں کے فطری قہقہوں کی طرح آزاد تھے ——!!
اور جب رخصت ہوتے ہوئے تم نے اداس ہو کر کہا "
گھر والے تیار نہیں ہو رہے ہیں، وہ اب بھی اپنی ضد پر قائم ہیں، اور وہ مجھے اسی انجینیر کے بچے کے گلے ہنڈ دینا چاہتے ہیں! ——"
اور میں نے بے تسخنی سی ہنسی ہنس کر کہا!
"کاش تمہارے گھر والے ہمیں اسی وقت دیکھ لیتے! —— انھیں کیا معلوم ہماری شادی ہو چکی ہے —— ہم ازل اور ابد کے ساتھی ہیں! ——
تم خاموش رہیں!
تمہاری ریشمی پلکوں پر نمی کانپنے لگی۔
اور میں نے بے اختیار ہو کر تمہاری پلکوں کو چوم لیا۔
یہ خواب نہیں حقیقت ہے ——! اور یہ حقیقت ماضی کے دھندلکوں میں تحلیل ہو چکی ہے ——!

"آنند جو ـــــ" اچانک انور صاحب بولے۔

"جی ـــــ"

"میں یادوں کے دھند لکے سے باہر نکل آیا ـــــ اور شمعیں جل رہی تھیں ـــــ!

ہال میں کچھ لوگ نیند کی آغوش میں سو گئے تھے، لیکن کچھ متنفس اب بھی بیدار تھے، شاید وہ اس لمحے کے منتظر تھے، جب آنند جو اپنے خواب آور لہجے میں اپنے تجربات کا کوئی دلچسپ واقعہ سنائیں گے، اور سناتے سناتے وہ نیند کی وادی میں ڈوب جائیں گے۔

وہ لمحہ آگیا تھا۔

بوڑھی پنڈتانی نے لمبی آہ کھینچی۔

پریم ناتھ نے بیوی کی گود سے اس کا بچہ لیا، اور اسے سلانے لگا۔ کول صاحب کھنکارے ـــــ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ابھی تک بیدار ہیں اور اسمال جو ڈرائی کلینر نے پتلی آواز میں کہا ـــــ

"آج رات برف نہیں گرے گی ـــــ"

"جب آپ بانہال میں کام کرتے تھے، تو کیا اتنی ہی برف گرتی تھی؟"

"انور صاحب، یہ تو بیس بائیس سال پہلے کی بات ہے ـــــ آنند جو نے کہنا شروع کیا، "میں دفتر میں بیٹھا تھا۔ اور کئی روز سے برف گر رہی تھی سب خاموش بیٹھے تھے، اچانک مجھے تار ملا۔ تار میں لکھا تھا"

ـــــــــ "COME, WIFE SERIOUSLY ILL"

"مجھے انگریزی آتی نہیں آنند جو، اس کا مطلب ـــــ" اسمال جو ڈرائی کلینر نے لجاجت سے کہا

"اسی میں تنّی کی بیماری کا لکھا گیا تھا، اور ——— اور میں سمجھ گیا کہ میں لٹ گیا ہوں، ایک گولی پار کر گئی میرے سینے کو ——— اور میں نے فوراً گھر جانے کا ارادہ کیا، سٹاف والے کہتے رہے کہ آپ کیسے جائیں گے، راستہ بند ہے پانچ سات فٹ برف جمی ہوئی ہے، اس وقت کوئی نہیں جا سکتا، لیکن میں نے کچھ نہ مانا ———"

"تو گویا آپ اسی برف میں نکلے؟" انور صاحب کی بےچینی بڑھ گئی۔

"یہی تو کہہ رہا ہوں میں تیار ہوا، دو قلی میں نے تیار کئے، اور ہم نے چند مختصر سا سامان باندھ لیا، صبح سویرے ہم نکلے، برف گر رہی تھی، اور ہم برف میں چلتے رہے ہم سرنگ کے پار پہنچ گئے بڑی مشکل کے بعد ———"

"پھر ———؟" پریم ناتھ نے پوچھا۔

"پھر ہم نے بید کی شاخوں کا بنا ہوا گول دائرہ نکالا، پہلے دو قلی اس پر بیٹھے ———"

"معاف کیجئے آنند جی، یہ گول دائرہ کیا تھا؟" میں نے پوچھا،

"بھئی بات یہ ہے، کہ اگر کوئی اتنی جمی ہوئی برف میں جانا چاہتا، تو جانے کی ایک ہی صورت تھی، اور وہ یہ کہ سرنگ کے نیچے برف کی سڑکوں پر آدمی پھسلتا ہوا اترے، طریقہ یہ تھا کہ گول دائرے پر آدمی بیٹھا اور بھگوان کا نام لیا، اور نیچے ہی نیچے آدمی پھسلتا چلا جاتا ———!

"لیکن یہ خطرناک ———"

"خطرناک تو تھا ہی۔ لیکن مجبور آدمی کیا کرتا؟ ——— مجھے یاد ہے کہ اس دن ابھی ایک دو میل سے زیادہ ہم نیچے نہ اترے تھے کہ اچانک

پہلا قلی جو سانڈ کی طرح موٹا تھا، اور جسیم تھا، اچانک اس کا گول، ایرہ ٹوٹ گیا۔ اور وہ دائیں جانب گیند کی طرح اُچھلا، اور نیچے برو کے کھڈ میں غائب ہو گیا، صرف اس کی ایک چیخ گونجی، اور فوراً برفستان میں گم ہو گئی، ——— ہم آگے نکل آئے تھے۔ اور اتنے میں باہر ایک ملا جلا شور سا بلند ہوا۔

آنند جو رک گئے!

ہم کان لگائے سنتے رہے ———!

"کوئی بات ضرور ہے ———" انور صاحب کے منہ سے نکلا

"ٹھہریئے، میں دیکھتا ہوں ——— کول صاحب بولے۔

وہ ٹوپی اوڑھ کر نکلے، اور میں نے بھی چادر کندھوں پر ڈالی۔ اور کول صاحب کے پیچھے پیچھے نکلا، ہال کے کونے پر خانصاحب کے کمرے کے باہر برآمدے پر ایک چھوٹا سا ہجوم تھا۔

ہم آگے بڑھے۔

میں نے دیکھا بڑے خانصاحب دروازے پر کھڑے مونچھوں کو تاؤ دے رہے تھے، اور ان کے دونوں لڑکے ایک تگڑے آدمی کی مرمت کرنے میں مصروف تھے، ایک خانصاحب نے اس آدمی کے گریبان کو پکڑ لیا تھا، اور بار بار اپنے سر سے اس کے سر کو چوٹیں دے رہے تھے اس کی نکسیر پھوٹ گئی تھی۔ اور دوسرے چھوٹے خانصاحب اس کے چہرے پر بھرپور ہاتھ مار رہے تھے،

کول صاحب نے بیچ بچاؤ کیا۔

ارے یہ تو وہی آدمی تھا ——— میں نے اسے پہچانا اس کی

ہیئت کذائی کے باوجود وہ اور آدمیوں کے ساتھ ہال میں آیا کرتا تھا
اور انور صاحب فوراً بیت اللہ کی تفصیلات چھیڑ دیتے، انہوں نے غلام
محمد کی بیوی کو ہال سے باہر قدم رکھنا محال بنا دیا تھا۔

دونوں چھوٹے خالصاحب اس کو اب گالیوں سے نواز رہے تھے

اور بڑے خالصاحب ہمیں دیکھ کر غرور اور غصہ سے بولے

"یہ حرام زادے بدمعاشی کرتے ہیں، بدمعاشی ——— انکو یہ
نہیں معلوم کہ یہاں کون شیر رہتا ہے، شہر کے سارے غنڈے اور
بدمعاش ہمارے زیر نگیں ہیں۔ سور کے بچے، وہ دوسرا حرامزادہ بھاگ نہ
جاتا تو اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا ——— لیکن میں کہاں چھوڑنے
والا ہوں ——— تم اب جاتے کیوں نہیں، سالے سور کے بچے بھاگ،
جا، ٹھرہ پی کے آیا ہے ہمیں ڈرانے ——— اس سے اچھا تو ایشیا ہی
پی لیتے ———"

خالصاحب رات کی تاریکی اور خاموشی میں بادلوں کی طرح
گرج رہے تھے اور وہ آدمی فرش پر گرا اپنا سا منہ لئے اٹھا اور وہاں
سے چلدیا۔ اور رات کے اندھیرے میں گم ہوا، وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس
کے ہونٹوں پر بھی خون کے دھبے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم فوراً نہ
آتے تو دونوں خالصاحب اس کی جان لے کر ہی رہتے۔

"آخر ہو کیا گیا ان کو، اتنی رات گئے ——— میں نے خالصاحب سے
پوچھا۔

اتنے میں انور صاحب پریم ناتھ اور سمار چند بھی آ گئے تھے،

"آیئے، اندر چلیں پہلے ———" پہلے بڑے خالصاحب اندر گئے

پھر دونوں چھوٹے خانصاحب، جن کے چہرے گیس لیمپ کی روشنی میں آگ کے انگارے بن چکے تھے، اور پھر ہم لوگ۔

"بات یہ ہے جناب، ہم اب سونے کی تیاری کر رہے تھے ——"
خانصاحب نے حقے کی نے سامنے لائی۔

"کہ دروازے پر دستک ہوئی، کھٹ کھٹ کھٹ —— دروازہ کھلا اور وہ دونوں اندر آئے، شراب کے نشہ میں دھت، جکڑاتے ہوئے ان کے کپڑوں پر شراب کے دھبے تھے ——
میں غصے سے دانت پیسنے لگا —— اور ایک سالہ کہنے لگا کہاں گئی یہ سالی —— یہ بھاگ کے آئی ہے، لیکن ہم —— اسے نہیں چھوڑیں گے —— اس کی —— جوانی نے —— مارا ہے، سالی اس کی زبان بری طرح لڑکھڑا رہی تھی —— اور میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ اپنے بھائی غلام محمد کی بیوی کے بارے میں ایسے ناشائستہ الفاظ بول رہا ہے، اس شام کا واقعہ بھی مجھے یاد آیا۔ یہی بدمعاش تو تھے وہ ——

اور پھر تو اس کا نشہ ہی اتر گیا
ہا ہا ہا ——
"سالے کا بھرکس نکال دیا ہم نے" ایک چھوٹے خانصاحب بولے آنکھوں کو گھماتے ہوئے
"میں نے وہ ہاتھ مارا کہ سالے کی ناک لہولہان ہو گئی اور نشہ غائب —— دوسرے فخر سے بولے۔
اور انور صاحب نے معنی خیز نظروں سے مجھے گھورا۔

"میں کل ہی ان کی رپورٹ دے دوں گا" گول صاحب بولے
"بھگوان ـــــ بھگوان ـــــ کیا لوگ ہیں یہ!" سمار چند
گھبرا کر پلکیں جھپکاتے رہے
"اچھا سبق دیا آپ نے ان بدمعاشوں کو ـــــ عشق کا بھوت
ہی ان کے سر سے اتار دیا ـــــ خوب" میں ہنسا
خانصاحب نے بھی بھرپور قہقہہ لگایا۔
اور جب ہم اپنے ہال کی طرف آ گئے تو انور صاحب نے برآمدے
پر ہماری طرف اپنی توجہ مبذول کی، اور کہا، سرگوشی کرتے ہوئے
غلام محمد اور ان کی بیوی گہری بلندیں ہیں "اب اس بات کا ذکر
وہاں نہ کریں تو اچھا ہے۔
سب نے انور صاحب کی بات کی تائید کی

●

کماری کی مزاج پرسی کرنے کے بعد میں ڈاک بنگلے کی سامنے کی پارک کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ کہ سامنے اختر نظر آیا، وہ ایک آدمی کو ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ ہدایات دے رہا تھا، میں سامنے آیا تو اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اور شکایتاً کہا کہ میں دو دنوں سے اسے ملا نہیں میں نے معذرت پیش کی ۔ اور اب میں وہاں سے جانا چاہتا تھا، لیکن اختر آج خوشی کے موڈ میں تھا، کہنے لگا۔

"کہاں جارہے ہو؟ —— پتہ ہے میں نے اپنا پروگرام "CHANGE" کر لیا"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں اب سرینگر نہیں جارہا ہوں ——"

میں اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔

اور اس نے کہا۔

"چلیئے، ذرا بازار تک گھوم آئیں، یقین نہیں آتا کہ آج برف نہیں گر رہی ہے ——"

"واقعی یقین نہیں آتا —— صبح جب میری آنکھ کھلی۔ تو پہلی بات جو میں نے دریافت کی، وہ یہ تھی کہ برف گر رہی ہے کہ نہیں اور جب میں نے سنا کہ نہیں گر رہی ہے، تو مجھے اعتبار نہ آیا،

ننگے پاؤں، دوڑا، اور دروازے سے باہر دیکھا، اور ———"
"بھئی، چوکیدار کہتا ہے کہ رات کو بالکل برف نہیں گری، وہ کہتا ہے کہ اب نہیں گرے گی،
ہم چلتے رہے،
راستے آج برف سے صاف کیے گئے تھے، مزدور اور قلی اپنے اوزار لیے ادھر سے ادھر جا رہے تھے،
آج مسافر لوگ بھی اپنی اپنی جگہوں، تاریک کونوں، ہوٹلوں، اصطبل نما کمروں سے نکل آئے تھے، اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے،

زندگی کے آثار کروٹیں لے رہے تھے،
"لیکن ابھی آسمان پر اتنے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں"
"ان کا کوئی ڈر نہیں ——— اچھا تو سنیئے میں نے اپنا پروگرام CHANGE کیا ہے، میں اب واپس جموں جا رہا ہوں ———"
جیپ تو میرے ساتھ ہی ہے میں نے ڈرائیور سے کہہ رکھا کہ جوں ہی بنتی ٹاپ کا راستہ کھل جائے، تو ہم جموں چلیں گے ———"
"لیکن جموں جا کر ———"
"جموں سے بائی ایر آئیں گے، تیس پینتیس منٹ میں سرینگر پہنچ گئے ———"
"اچھا تو آپ بائی ایر جائیں گے؟"
"اور کیا بھئی یہ راستہ تو" 2 "جیسے HOP سے پانچ آٹھ روز میں ٹھیک بھی ہو گیا، پھر بھی اس پر کچھ بھروسہ نہیں ——— خونی نالہ

شیطانی نالہ ـــــ اور دوسرے خطرناک مقام ـــــ خطرناک کھائیاں، جو انسان کے خون کی پیاسی ہیں ـــــ نا بھائی میں تو باز آیا، میں واپس جموں جاؤں گا، اور وہاں سے جہاز سے آؤں گا
بات تو واقعی معقول تھی
کیوں نہ میں بھی ایسا ہی کر دوں، لیکن ـــــ
" اور میں نے طے کیا ہے کہ آپ کو بھی ساتھ لیتا چلوں ـــــ "
" مجھے ـــــ ؟
" ہاں، ہاں، جیپ تو ہمارے ساتھ ہے ہی، ساتھ چلیں گے، اور وہاں سے ساتھ ہی سری نگر جائیں گے، خوب COMPANY رہے
" بات تو ٹھیک ہے لیکن ـــــ "
" لیکن کیا ـــــ ؟
" لیکن ـــــ بھئی بات یہ ہے کہ میرے پاس اب پیسے بہت کم رہ گئے ہیں۔ اور "
" ارے، کمال ہے، جب تک میرے پاس پیسے ہیں، خرچ ہوتے رہیں گے، اور ہاں، جموں سے تار منی آرڈر سے روپیہ منگائیں گے، یہ بھی نہیں تو جموں میں کسی دوست سے روپیہ لیں گے، بھئی وہاں پہنچ کر ہزار راستہ نکل سکتے ہیں ـــــ "
" بادشاہو کچھ کچھ مالوم ہے آپ کو ـــــ ؟" سامنے سردار صاحب نظر آئے، داڑھی کے خشک جنگل میں انتشار لئے ہوئے، ان کی بغل میں پریم کمار تھے، سمٹے سمٹائے ـــــ
" کیا ـــــ ؟" میں نے کہا۔

"راستہ پر دن رات کام لگا ہوا ہے، اور افسر لوگ کہہ رہے تھے کہ تین دن کے بعد کانوائے جائے گی ــــــ"

"اور دوسری بات سنی آپ نے؟" پریم کمار منمنائے

"نہیں تو ــــــ؟"

"جموں کی طرف والا راستہ کل کھل جائے گا ــــــ"

"سچ ــــــ؟"

"اور کیا بادشاہو ــــــ گوروجی کی کرپا ہے۔ ورنہ ہماری قسمت کھراب ہے"

"یہی تو کہہ رہا ہوں آپ سے ــــــ" اختر نے کہا ــــــ "بھئی کل تیار رہئے ہم لوگ جموں جائیں گے ــــــ"

"تو کیا آپ واپس جموں جائیں گے، رفیق صاحب ہم لوگوں کو یہاں چھوڑ کر ــــــ؟"

سردار جی بولے ــــــ "یہ پریم کمار صاحب بھی واپس جموں جانا چاہتے ہیں"

"اور کیا کریں جی؟ ــــــ یہاں تو برف نے میرا حلیہ بگاڑ دیا۔ آگے وادی میں کیا ہوگا ــــــ توبہ، توبہ ــــــ ہم تو باز آئے ایسی برف سالی سے ــــــ"

"بھئی میں نے ابھی اس پر سوچا نہیں ــــــ ہاں یہ اختر صاحب کہہ رہے ہیں ــــــ"

میں نے سردار جی سے کہا۔

اور ہم آگے چلے

میرے دل میں مسرت کی لہریں اٹھ رہی تھیں، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے دل کے نہاں خانوں سے کوئی غیبی آواز کہہ رہی ہے۔

اب یہ مصیبت کا زمانہ جلد ختم ہو گا، یہ آواز جیسے سنہری کرنوں کا سرچشمہ تھی —— میرے خیالوں میں کرنوں کی بارش ہونے لگی

بہت جلد میں دادی کی دھڑکتی ہوئی، گلبار رہگزار دل پر قدم رکھوں گا، یہ پہاڑ دیکھتے رہ جائیں گے، اور پھر میں جانی پہچانی مانوس گلیوں سے ہو کر اپنے محلے میں پہونچ جاؤں گا —— اور پھر اپنے مکان کی صحن میں ——

پھر مکان کی دہلیز —— باورچی خانے سے نکلتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو، —— اور پھر ماں کے چہرے پر شفقت کے نور کا سیلاب —— ممتا کے آنسو —— پھر مریض والد صاحب کی رعشہ دار آواز —— اور پھر چاچے، چاچیاں، بچے —— محبت ہی محبت —— شور وغل —— !مسرتیں —— !اور پھر وہ بے تاب لمحہ، جب میں رضی کے بارے میں اپنی غمگسار چاچی سے پوچھوں گا اور وہ تفصیل کے ساتھ ——

"رفیق صاحب آپ میری شادی پر آئیں گے نا؟" اختر نے مجھے چونکا دیا۔

"آپ بلائیں گے تو ضرور آؤں گا،" وہاں پہونچ کر آپ کو یاد" میں جملہ پورا نہ کر سکا، سامنے غریب مسلم ہوٹل کی طرف لوگ، دکاندار بھاگے جا رہے تھے، اور وہاں ایک بھیڑ تھی، اور بھیڑ میں دو آدمی گتھم گتھا تھے —— !

ہم بھی وہاں پہونچے۔

میرے تعجب کی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ جوشیلا نوجوان دکاندار سے لڑ رہا ہے۔ اور دونوں وحشیانہ انداز سے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے ہیں۔ دونوں کے ہونٹوں پر جھاگ آ گئے تھے، دونوں کے سر سے ٹوپی غائب تھی، اور کپڑے دریدہ ہو گئے تھے،

مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے بیچ بچاؤ سے یہ لوگ سنبھلنے والے نہیں

"IDIOTS ———" اختر صاحب بڑبڑائے،

ساتھ کھڑے ایک آدمی نے کہنا شروع کیا۔ جیسے وہ اختر صاحب کے سوال کا جواب دے رہا ہو۔

"بڑا خراب آدمی ہے یہ، دکاندار کی کوئی خطا نہیں، ایک تو کھانا کھایا اس نے، اور پیسے نہیں دیگے، کہتا ہے، میں نے پانچ کا نوٹ دے دیا" اور اس پر باقی روپیہ نکالتا ہے، دکاندار کہتا ہے، صاحب، ابھی آپ نے کہاں پیسہ دیا، بارہ آنے دیجئے ——— اس پر یہ آدمی لگا گالیاں دینے —"

"ہٹو جی ——— ہٹو، میں کہتا ہوں چھوڑو اس کا گریبان ——— چھوڑتے کیوں نہیں، چھوڑ دو اسے ——— چھوڑو ———"

ایک دیو قامت دکاندار آگے آیا۔ اور اس نے گرجتے ہوئے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ———

"بدمعاش، سالا، بے ایمان، حرام خور ——— پانچ کا نوٹ لیا ابھی، اور ابھی کہتا ہے کہ کچھ نہیں لیا، ——— لے ابھی تجھے تھانے لے جاؤں گا تیری کھال ادھیڑ دوں گا" ———"

جوشیلا نوجوان کیچڑ سے لت پت ٹوپی دکان کی دیوار سے جھاڑ

رہا تھا۔

اور دکاندار چھوٹی چھوٹی مونچھیں پھڑکاتا ہوا، کچھ برتن ادھر سے ادھر اٹھا رہا تھا۔ اور ہر گالی کا جواب گالی سے دے رہا تھا

"DAMN THEM BEASTS" اختر صاحب کے بھرے بھرے چہرے پر بیزاری کے سائے لہرائے اور وہ سامنے سڑک کی طرف آگئے

سڑک پر حاجی صاحب زور زور سے اس واقعے پر اظہار خیال کر رہے تھے، لیکن وہاں چند قلیوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"یہ لوگ دل میں خوف خدا نہیں رکھتے ——— آسمان سے بلائیں نازل ہو رہی ہیں، اور یہ فحش کلامی کرتے ہیں ——— اللہ انہیں جہنم رسید کرے گا، یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے"

"الو کے پٹھے ہیں یہ حرامی، سور کے تخم ———" سامنے حیدر ملک نے حاجی صاحب کی بات کی تائید کی۔

حاجی صاحب فوراً آگے چلے، وہ دور تک بڑبڑاتے رہے، "لاحول ولا قوۃ لاحول ......"

ہم چند قدم ہی چلے تھے، کہ کول صاحب آئے اور چھوٹتے ہی بولے۔

"برف تو تھم گئی تھی، اور کام بھی خوب ہو رہا تھا ایک دو روز تک راستہ کھل جاتا، جہاں پسی گری تھی وہاں سڑک بنائی جا رہی ہے۔ لیکن ———"

"لیکن کیا؟"

میں نے بے چینی سے پوچھا، اختر صاحب بھی اُسے توجہ سے دیکھنے لگے

"لیکن آگے بانہال کے اس طرف اور اس طرف برف سے راستہ بند ہے۔ برف بہت گری ہے، اور ———"

کول صاحب نے اپنے گرد وپیش آنکھیں گھما کر کہا، آہستگی کے ساتھ،
"اور یہاں کے جو لڑکے گئے تھے، ـــــ گرے نا اس دن؟ ـــــ
"وہ ٹریننگ یافتہ نوجوان ـــــ؟ وہ جو پیدل گئے ـــــ؟"
"ہاں ـــ ہاں - کیا ہوا ان کو ـــــ؟"
"وہ برف کے طوفان نے بہا لئے اپنے ساتھ، اور اب ان کی لاشوں کو نکالا جا رہا ہے۔"
"سچ؟ ـــــ میں دھک سے رہ گیا
"جی یہ ہوائی کسی نے اڑائی ہوگی ـــــ" اختر صاحب بولے
"نہیں جناب، ابھی یہ بات یہاں کسی کو معلوم نہیں ـــــ"
"آپ پر کیا الہام نازل ہوا، آپ ـــــ" اختر صاحب طیش میں آگئے۔
"میں نے وائرلیس پر بات کی، بانہال ملٹری پوسٹ والوں سے۔"
"آپ نے ـــــ؟"
"جی ہاں، کول صاحب کو نہیں جانتے آپ؟" میں نے تعارف کرایا
سی، آئی، ڈی میں، اور ـــــ"
"Oh I see ـــــ" اختر صاحب نرم پڑ گئے، "مجھے اختر کہتے ہیں، انجنیر ہوں ـــــ میں ـــــ"
وہ تعارف کرانے لگا، اور مجھے محسوس ہوا جیسے دل کی وادیوں میں اچانک اندھیرے پھیل گئے!!

وہ غالباً یہاں کی سب سے بڑی دکان تھی، کونسی چیز تھی جو اس دکان سے دستیاب نہ ہو سکتی تھی، مختلف مصالحہ جات سے بھرے ہوئے ٹین گھی، شکر، دالیں، زعفران، شہد، خشک میوے، مثلاً اخروٹ، بادام پستہ، کھجور، خوبانی، یہ سب اور دوسری چیزیں بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکسوں اور بوریوں میں بھری پڑی تھیں، اس کے علاوہ دکان کے ایک حصے میں بزازی بھی تھی، ساتھ ہی دوسری روزمرہ استعمال کی چیزیں، مثلاً اچھاتے ٹوپیاں، مفلر، سیاہ چشمے، کھڑاؤں وغیرہ بھی موجود تھے، دو آدمی خریداروں سے الجھے ہوئے تھے، اور سول جند دکان کے ایک حصے میں، جہاں لوگوں کی خریدی ہوئی، چادریں، کوٹ، گھڑیاں، ٹوپیاں، برتن اور دوسری چیزوں کے ڈھیر پڑے تھے، قیمتی حک کمبل گھٹنوں پر ڈالے، فربہ اندام جسم پر دو تین گرم کپڑے کی قمیصیں، ایک ڈھیلی ڈھالی سوئٹر اور پٹو کا بند گلا واسکٹ پہنے ہوئے، فرشی حقہ گڑگڑا رہے تھے، ان کی چھوٹی سی چمکتی ہوئی آنکھیں گول چہرے پر ابھری ہوئی گوشت کی تہوں میں دب سی گئی تھیں وہ ہاتھ میں گھڑی لے کر اسے دور سے یوں دیکھ رہا تھا، جیسے گھڑی کی اندرونی ساخت، اور کام کرنے والے پرزوں کو تول رہا ہے، اس نے ایک بار ہی گھڑی دیکھ لی، اور حقہ کا کش لے کر کول صاحب سے مخاطب ہوا۔

"بھئی ایسی گھڑی اب چلنے کو نہیں۔ کیا سمجھے؟" اس نے بایاں ہاتھ اپنی آگے کو نکلی ہوئی توند پر پھیرا۔ اس کی سانس مشکل سے نکل رہی تھی

"لیکن یہ تو چلتی ہے ——" کول صاحب نے گھبرا کر کہا۔

"مطلب یہ ہے، کہ یہ پرانا، ڈیجائن ہے —— کیا سمجھے"

"میں پیچ وتاب کھانے لگا" اور مجھ سے رہا نہ گیا۔

"سیٹھ صاحب، یہ بالکل نیا ڈیزائن ہے، ابھی ایک ماہ قبل میں نے دہلی سے خریدی ہے ——"

"برخوردار کسی نے ٹھگ لیا ہوگا، دہلی کے ٹھگ تو مشہور ہیں۔ کیا سمجھے"؟

"اب باتیں زیادہ کرنا بیکار ہے، آپ بتایئے آپ اسے لیں گے کہ نہیں؟

"لیں گے، لیں گے کیوں نہیں؟ ہمارا کام ہی یہی ہے۔ کام نہ کریں تو پیٹ کا انجن کیسے چلے؟ —— کیا سمجھے ——؟

"ہم سب کچھ سمجھ رہے ہیں کول صاحب بیچ میں بولے،

"اب بات ہے کہ آپ کتنے دام دیں گے، اس کے؟ ——"

"بھئی دام یہ کیا لگائیں گے؟ دام لگانا تو آپ کا کام ہے، ہم اس دکاندار نہیں خریدار ہیں، یہ بزنس کے راز ہیں، راز —— کیا سمجھے؟

"یہ گھڑی میں لے ایک [illegible] پچیس میں [illegible] ہے، آگے آپ کی مرضی"

میں اس گفتگو کو مختصر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ فٹ بال کی طرح پھولا ہوا گردہ صورت والا انسان خواہ مخواہ بات کو طول دے رہا تھا، اور میری بےچینی بڑھ رہی تھی، اگر کوئی ادھر سے گذرے، اور

دیکھ لے کہ میں اپنی گھڑی کا سودا چکار رہا ہوں، تو کتنا برا ہوگا' ــــــ میں اندر ہی اندر شرم سے پگھلا جا رہا تھا ــــــ

"رام رام یہ گھڑی اور ایک سو پچیس میں ــــــ ؟ برخوردار اس سے اچھا تھا کہ آپ اپنا پیسہ دریا میں ڈال دیتے! ــــــ آپ کو معلوم نہیں کہ ــــــ"

"دیکھئے سول چند صاحب آپ خوامخواہ معاملے کو لمبا بنا رہے ہیں آپ بتایئے کہ آپ کتنے میں خریدیں گے اسے، ہمیں منظور ہوا تو سودا ہو جائے گا۔"

کول صاحب نے چڑھ کر کہا،

"میں اتنے میں ہی خریدوں گا، جتنی یہ قیمت رکھتی ہے، نہ ایک پیسہ زیادہ نہ ایک پیسہ کم،

ایک بار پھر سول چند نے سامنے نمدے سے گھڑی اٹھائی اور اسے دور سے دیکھنے لگا۔

"میں چالیس اور پانچ میں خریدوں گا اسے، کیا سمجھے ؟"

"پینتالیس میں کل ؟ میری زبان سے نکلا، میرا خون کھول رہا تھا، جی میں آیا یہی گھڑی اس کے ہاتھ سے چھین کر اس کے چہرے پر دے ماروں، اور کہدوں حرام خور! تو ایک سو پچیس میں خریدی ہوئی چیز کے صرف پینتالیس دے رہا ہے،

لعنت ہے تم پر ــــــ مردود!

لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا

میرا سارا جسم کانپ اٹھا۔

اچانک میرے دل میں آیا کہ واپس اپنی گھڑی اٹھالوں، اور کلائی میں باندھ لوں ——!

لیکن دوسرے لمحے مجھے پریم ناتھ کا چہرہ نظر آیا، دنیا بھر کی بیچارگی، اور مجبوری لئے ہوئے، جس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے دھواں اٹھ رہا تھا، اور آواز میں صدائے ماتم چھپائے ہوئے تھا

"آپ کے بغیر میں یہ بات اور کسی سے نہیں کہہ سکتا —— آپ میرے کلاس فیلو رہے ہیں، میرے ساتھی، میرے بھائی —— اس وقت مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے، اگر آپ نے مدد نہ کی۔ تو میری بیمار گھر والی اور دو چھوٹے بچے مر جائیں گے —— اب میری جیب میں ایک پائی نہیں رہی —— اور کل سے ہم نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ پانی بھی نہیں پیا ہے۔ آپ مجھے دس بیس روپیہ ادھار دیں، میں پائی پائی ادا کروں گا سر ٹھیکر یو نجکر، یہاں تو کوئی واقف نہیں جان پہچان کا نہیں، آپ کے بغیر میں اور کسی سے ——"

یہ کہتے ہوئے اس کی پیلی پیلی آنکھوں سے آنسو کی سلگتی ہوئی دھارا امڈ آئی۔ اور اس کا لہجہ تھر تھرا کر منجمد ہو گیا۔

"میں ابھی آدھ گھنٹے میں ملوں گا" ذرا بازار تک جا رہا ہوں۔ آپ ضرور روپیہ لیجئے۔ آپ روتے کیوں ہیں بابا، مصیبت کے دن اب تھوڑے ہیں۔ ہمت سے کام لیجئے ——"

میں اسے کہتا رہا اور میرا دماغ ایک عجیب چکر میں تھا! میری جیب میں اب پندرہ روپے رہ گئے تھے، جو انور صاحب کو ادا کرنے تھے، کیونکہ فی الحال انور صاحب ہی آٹے دال پر پیسے خرچ کر رہے تھے،

اب میں پریم ناتھ کے لئے روپے کہاں سے لاؤں ـــــ ؟ کس سے مانگوں

یہاں کون کسی کی حاجت روا کر سکتا ہے ؟

میرے دماغ کے خانوں میں دھواں پھیل رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔

میرا جسم کانپ رہا تھا!

لیکن پریم ناتھ کے آنسو ـــــ آنسوؤں کی دلگداز داستاں ۔۔

اس کے بچوں کی بھوک ـــــ اور اس کی گھر والی کی مجبوری ۔۔!

یا اللہ اب میں کیا کروں ؟

اب کیا ہوگا ـــــ ؟

اب کیا ہوگا ـــــ ؟

میری سوچ کے ویرانوں میں آندھیوں کا رقص تھا!

اچانک مجھے کول صاحب کے لہجے کی ترقی اور گھلاوٹ میں ڈوبے ہوئے

یہ الفاظ ذہن میں گونجنے لگے۔

"جب میری جیب خالی ہو گئی، تو میں نے ایک نئی کشمیری لوئی ایک دکاندار

سول چند کو بیچ دی ـــــ مرتا کیا نہ کرتا ـــــ ؟ پورے ستر روپے میں

خریدی تھی لیکن اس نے تیس ہی روپے دے دیئے، میں نے غنیمت جانا

اور اب پیٹ بھر کر کھانا تو کھا رہا ہوں ـــــ"

یہ الفاظ ایک ایک کر کے مجھے یاد آ رہے،

ایک ایک لفظ سے روشنی پھوٹ رہی تھی!

دماغ کے خانے روشن ہوتے گئے ـــــ!

اور میں ڈاک بنگلے سے نکلا، میں نے دہلی سے خریدی ہوئی رسٹ

واچ نکالی، اسے دائیں ہاتھ میں دبایا۔ اور پورے بازار میں گھوما کول صاحب

کی تلاش میں ــــــ لیکن وہ کہیں نظر نہ آئے، ــــــ کہاں گئے ہیں وہ؟

میں انہیں ادھر ادھر ڈھونڈتا رہا ــــــ پھر میں نے سب ہندو ہوٹلوں کو چھان مارا۔

اور جتنے بھی لوگ مجھ سے ملتے رہے، ان سے میں نے کول صاحب کے بارے میں پوچھا، لیکن کوئی صحیح اطلاع نہ مل سکی۔

"شاید وہ ملٹری کیمپ میں ملیں گے ــــــ" ٹریفک انسپکٹر نے چھڑی اور آنکھیں تیز رفتاری سے گھماتے ہوئے مجھے اطلاع دی۔

اور میں ملٹری کیمپ کی طرف دوڑنے لگا۔

ملٹری کیمپ اوپر پہاڑی پر تھا۔ لیکن شکر ہے کہ راستہ سے برف ہٹائی گئی تھی ــــــ

میں ہانپتے ہوئے، پسینے میں شرابور چلتا رہا۔

اتفاق سے وہ سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

اور میں نے انھیں کہا کہ میں یہ گھڑی بیچنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میری جیب بھی اب خالی ہو گئی ہے ــــــ"

"دیکھیے سول چند ــــــ پینتالیس بہت کم ہیں۔ ذرا انصاف سے کام لیجیے، آپ ــــــ"

"برخوردار، مجھے ایدلشی کی کیا ضرورت ــــــ یہ بزنس کا معاملہ ہے، بزنس کا کیا سمجھے ــــــ! خیر آپ کہتے ہیں، اسی لئے دو روپے اور بڑھاتا ہوں، اپنی جیب سے دینے ہوں گے ــــــ"

اس نے اچانک ملازم کو آواز دی۔

"بھولے، او بھولے"

"جی سرکار ——"

"پیٹی سے چالیس، پانچ اور دو کے نوٹ لے آؤ ——"

"اچھا سرکار ——"

میں دیکھتا ہی رہا۔

اور دوسرے لمحے وہ نوٹ میری جیب میں تھے۔

اور گھڑی مول چند نے ہلدی کی بوری پر ڈال دی تھی۔

●

یہ دن آزادی کا دن تھا، دلوں میں آرزوؤں کی دبی دبی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں، یہ دن مسرتوں کا پیام لے کر آیا تھا، یہ روشنیوں کا دن ——— آسمان کی نیلاہٹوں میں سورج بے پناہ تابناکیوں کے ساتھ سرگرمِ سفر تھا، بادلوں کے آوارہ ٹکڑے سراسیمہ ہو کر پہاڑوں کے اس پار بھاگ رہے تھے، اور فلک بوس چوٹیوں کی اوٹ میں اپنا منہ چھپا رہے تھے ———!

ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے آج صدیوں کے بعد بادلوں کی سنگلاخ چٹانیں پگھل چکی ہیں، اور آسمان کی وسیع اور بیکراں وسعتوں میں سورج آزاد ہے ——— بالکل آزاد، اور بادلوں کی فولادی دیواریں ڈھ گئی ہیں ———

رنگ و نور کے سیلاب امنڈ رہے تھے!

صبح ہی صبح، جبکہ پہاڑوں کی بلند ترین چوٹی پر جمے ہوئے بادلوں کے ویرانوں میں سورج نے الاؤ روشن کئے تھے،

تو اندر صاحب جو ہمیشہ بہت سویرے اٹھنے کے عادی تھے، ہال میں داخل ہوئے، اور انہوں نے وفورِ مسرت سے ایک نعرہ لگایا:

"سمار چند، آنند جو، غلام محمد ——— رفیق صاحب اٹھئے، اٹھئے ——— آج سورج چڑھا ہے، بادلوں کو آگ لگ چکی ہے

آج ـــــــ آج تیز دھوپ نکلے گی ـــــــ"

انور صاحب کی مسرور آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

ہال میں آج خلاف معمول بہت زیادہ روشنی بکھر چکی تھی!

دھوپ ـــــــ!!

ایک کیف آور نغمہ میرے کانوں میں سرسرایا۔ جیسے گھنی جھاڑیوں میں ایک آہستہ خرام، جوئبار کا گیت!

"سچ، دھوپ نکل آئی ہے؟" سمسار چند نے ایک لمبی انگڑائی لی اور کئی بار پلکیں جھپکائیں۔

"آج میں نے ایک سپن دیکھا تھا ـــــــ" آنند جو پہلے ہی بیٹھے تھے

اور منہ ہاتھ دھو چکے تھے، "سپن میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں [illegible] ہوں ـــــــ

اور ـــــــ"

"بھگوان کی دیا ہے ـــــــ" بوڑھی پنڈتانی پوپلے منہ سے [illegible]۔

"پریم ناتھ اٹھ کھڑا ہوا، اور باتھ روم کی طرف دوڑنے لگا۔

اس کے بچے رونے لگے،

"میں باہر جا کر دیکھ تو آؤں ـــــــ" غلام محمد بے تاب ہوا۔

اس کی بیوی بھی اس کے پیچھے پیچھے گئی۔

"پہلے میں سجدہ شکر ادا کر لوں ـــــــ" انور صاحب نے تکیہ کے نیچے سے حج سے لائی ہوئی جا نماز نکالی۔

آشا خوش ہو کر بوڑھی نانی کو جگانے لگی۔

میں وارفتگی کے ساتھ ابھرتے ہوئے سورج کا یہ جادو اثر منظر دیکھ رہا تھا ——— !

سورج اب پہاڑوں کی چوٹیوں پر آ لٹکا تھا' ایک شان وقار کے ساتھ، زندگی اور مسرت کا جگمگاتا ہوا پیغام لے کر ——— !

اور سامنے برف پوش پہاڑوں کے سلسلے روشنی کے سمندر میں نہا رہے تھے' ———

یہ اجلی اجلی سفید برف" اور یہ سورج کی تازہ، شاداب اور تنیز روشنی ———"

کیا انسان کی نظریں اتنی روشنی کی تاب لا سکتی ہیں؟

اتنے روز روشنی کے یہ امڈتے ہوئے سمندر کہاں چھپ گئے' تھے

کن تاریک قوتوں نے اس سمندر کو روک لیا تھا؟

لیکن اب دنیا کی کوئی طاقت ابھرتے، بڑھتے سورج کی یہ پھوٹتی ہوئی روشنی روک نہیں سکے گی' ——— ! کبھی روک نہیں سکیگی کبھی نہیں' ———

"مبارک ہو ——— مبارک ہو ———" دور سے ہی بڑے خانصاحب کی آواز آئی' وہ دانتوں پر برش پھیر رہے تھے'

"جی ہاں، واقعی مبارک کی بات ہے ——— ہماری آزادی کا دن آ رہا ہے نزدیک ———" میں نے مسکراتے ہوئے کہا!

"تھوڑی دیر بعد جب ہم نے چائے پی لی، تو سارے لوگ برآمدے میں جمع ہو گئے اور سامنے حسین مناظر کی رنگا رنگی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

دس بجے کے قریب یہ خبر سرعت کے ساتھ پھیل گئی کہ جموں کا راستہ کھل گیا ہے۔ اور ایک بس واپس جموں جا رہی ہے۔ کیونکہ بہت سے مسافر واپس جموں جانے پر اصرار کر رہے تھے، کتنی مسرت افزا خبر تھی یہ —— کتنی حوصلہ افزا ——!

ایک کھلبلی سی مچ گئی!

ایک انتشار پھیل گیا!!

بہت سے لوگ واپس جموں جانے کی تیاریوں میں جٹ گئے بہتیرے بکس سمیٹنے جانے لگیں ایک دوسرے سے اجازت روانگی لی جانے لگی —— چاروں طرف لوگ بھاگنے دوڑنے لگے، ایک ردار دی کا عالم تھا ——!

ہمارے مسکن میں سے غلام محمد اور اس کی بیوی جانے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے، اور میں نے بھی بستر باندھ کے رکھا تھا۔

ایک بجے دن بس جا رہی تھی۔

اور اسی وقت میں بھی جا رہا تھا۔ اختر صاحب کے ساتھ جیپ میں اختر نے صبح ہی کو مجھے چوکیدار کے ہاتھ کہلوا بھیجا تھا، اور پھر اس سے مل کر میں نے طے کیا تھا کہ میں واپس جموں جاؤں گا،

میری جیب بھی اب گرم تھی۔

میرے جموں جانے کے ارادے کے اظہار پر میرے ساتھی بہت اداس ہو گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اختر صاحب کے اصرار پر جا رہا ہوں۔

پریم ناتھ اور اس کی بیوی نم آلود نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکے، اور ان کی آنکھوں کی نمی، جیسے میرے بغیر وہاں اور

کسی نے نہ دیکھا، کہہ رہی تھی ہم عمر بھر آپ کے احسان مند رہیں گے، اور بہت جلد آپ کی پائی پائی چکا دیں گے،

سمارچند اور آنند جو نے مجھے روکنا چاہا،

لیکن ——— ؟

اور پھر انور صاحب نے میرے اصرار پر حساب جوڑ دیا میں نے اپنے پیسے ادا کیے،

آج دوپہر کا کھانا میں ہوٹل میں کھانے جا رہا تھا۔

"آخر آپ کیوں جا رہے ہیں؟ اب تو راستہ دو تین روز میں کھل جائے گا"

کول صاحب نے مجھے مشورہ دیا۔ اپنے نرم لہجے میں۔

میں خاموش رہا۔

یہ نہیں کہ مجھے اس راستہ پر اب کوئی بھروسہ نہ رہا تھا — بلکہ اصل بات یہ تھی کہ میں پر لگا کر اڑ جانا چاہتا تھا،

وادی کا ذرہ ذرہ مجھے پکار رہا تھا۔

میرے عزیز مجھے بلا رہے تھے"!

میری رشی ——— !

میں دین محمد کی دکان پر گیا۔ تو آج وہاں ایک اور ہی عالم نظر آیا، خواجہ صاحب چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے گالیاں بک رہے تھے ان پر خفقان کی حالت طاری تھی، ذیلدار اور دوسرا دیہاتی دونوں گم سم بیٹھے تھے۔ شاہ صاحب وہاں اس وقت موجود نہ تھے،

جوشیلا نوجوان کہہ رہا تھا"

"میں پہلے ہی دن سمجھ گیا تھا یہ ڈاکو ہے ——— ڈاکو ———"

"آخری زمانہ ہے، آخری زمانہ ——— حاجی صاحب داڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے جلدی جلدی۔

"حدیث شریف میں آیا ہے، کہ آخر زمانہ کے درویش باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور ہوں گے! یہ لوگ بھیس بدل کر لوگوں کو گمراہ کریں گے ——— یہ لوگوں کو کفر کے اندھیرے میں ڈال دیں گے ———"

"ہاہاہا ——— کفر کے اندھیرے ———"

دین محمد کا طنزیہ قہقہہ گونجا

میں حیران و ششدر یہ منظر دیکھ رہا تھا،

"آخر ہوا کیا صاحب ———؟"

مجھ سے رہا نہ گیا۔

"ہونا کیا تھا ——— دین محمد نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "شاہ صاحب جنگل سے اتر آئے تھے۔ پھر غائب ہوئے جنگل میں"۔

"کیا مطلب؟"

"آپ ——— کیا مطلب، مطلب کہہ رہے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا" خواجہ صاحب پھر چیخے، ان کی گھنی مونچھیں پھڑپھڑائیں، میں لٹ گیا، میں تباہ ہو گیا، برباد ہو گیا، میری آنکھ لگی، اور یہ ڈاکو میرا اسکٹ چرا کے بھاگا ہے ——— اس میں میرا سات سو روپیہ تھا، میری ساری پونجی گئی۔ اب میں کیا کروں ———؟

اور ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔

اگر وہاں ایک گھمبیر ماحول نہ بنا ہوتا، تو شاید میں ایک بلند آہنگ قہقہہ لگاتا، لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔

"اچھا تو شاہ صاحب بھاگ گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بھاگ گیا ہے سالا، اور سات سو روپیہ بھی لے گیا ہے۔ سویرے سے ہم لوگ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے ہیں، پولیس کو بھی میں نے ہی اطلاع دی، ــــــ لیکن وہ ــــــ"

وہ جنگل میں غائب ہو گیا ہے، مرد قلندر رہے ــــــ مرد قلندر!

دین محمد اس وقت بڑھ چڑھ کر ان پر طنز کے نشتر برسا رہا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ پہلے دن سے دین محمد شاہ صاحب کے خلاف بولتا رہا تھا۔ لیکن لوگوں نے ان کی ان باتوں کو دین محمد کی بد دماغی پر محمول کیا۔

آج وہ دین محمد کی باتوں کی صداقت پر ایمان لائے تھے،

لیکن بے سود ــــــ!

"یہ تو دس نمبر چور تھا، بے ایمان ــــــ!" ذیلدار کا منہ کھلا "اس کے پیر دباتے دباتے میرا بدن تھک گیا ہے، میرے بازوؤں میں درد ہو رہا ہے راتوں کو ہم اس کے پیر دباتے رہے ــــــ چور، بے ایمان ــــــ"

"اللہ تعالیٰ ایسے درویشوں کو واصل جہنم کرے گا ــــــ" حاجی صاحب بولے، مجھے ان کی بات سن کر ہنسی آ گئی، کیونکہ پہلے کئی بار ان کی زبانی شاہ صاحب کی تعریفیں سن چکا تھا، بد قسمتی سے انہوں نے مجھے ہنستے ہوئے دیکھا تو چڑ کر بولے۔

"آپ لوگ ہنستے ہیں، آپ کو کیا معلوم ایسے گندم نما جو فروشوں نے اسلام کو بدنام کیا ہے، یہ لوگ مذہب ــــــ"

"آپ کو مذہب کی پڑی ہے، حاجی صاحب، سمجھ میں نہیں آتا، میں کہتا ہوں اب میں کیا کروں، میں لٹ گیا، تباہ ہوگیا، برباد ہوگیا ـــــــ"!

خواجہ صاحب کی چیخ اور پکار مضحکہ خیز بھی تھی، اور ہمدردی طلب بھی۔

ان کی دستار ڈھیلی پڑ چکی تھی،

ان کا چہرہ زرد تھا۔

"میں نے کہا، میرے پاس آیا تھا، نہ جانے کتنے دنوں کا بھوکا تھا، آنکھوں میں موت ناچ رہی تھی، اور ٹھٹھر رہا تھا، سردی سے، میرے پاس صرف دو قمیصیں تھیں، میں نے ایک قمیص دے دی، روز کھانا دیا، درویش کے بچے کو۔"

دین محمد کے لہجے میں اس وقت طنز کی چبھن نہ تھی

غالباً یہ پہلا موقع تھا، جب کہ وہ غم و غصہ اور طعن و تشنیع کا غلاف چڑھائے بغیر بول رہا تھا،

اور میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا، اس کے الفاظ میرے ذہن میں گونج رہے تھے،

"میرے پاس صرف دو قمیضیں تھیں، ایک اسے دے دی روز کھانا دیا ـــــ

"جیب میں پیسہ نہیں ہوتا، اور گھر سے نکلتے ہیں ـــــ اور لوگ بھی کھانا کھاتے ہیں یہاں، بھوکے کو کھانا نہ دیا جائے تو وہ مر جائیگا ـــــ میں نے کہا اب یہاں مردوں کے لئے کفن کا انتظام کون کرے۔ میں دیتا ہوں انھیں کھانا، بیچاروں کی جیبیں خالی ہیں، اور سفر میں ہیں، کریں تو کیا کریں میں کتنوں کو دیتا ہوں کھانا، اسے بڑی عبادت سمجھتا ہوں، لیکن یہ کیا پتہ ہوتا ہے ان میں چور بھی ہیں ـــــ"

دین محمد کا لہجہ اب بھی صاف تھا،

اور دین محمد کی شخصیت سے ظاہری لبادہ اٹھ چکا تھا، میرے سامنے دین محمد اصلی صورت میں جلوہ گر تھا ــــــ

اس کے سینے میں پتھر نہیں۔ ایک ہمدردی سے دھڑکتا ہوا دل ہے میں اسے عقیدت اور محبت کی نظروں سے دیکھتا رہا۔

اور جب میں وہاں سے نکلا، میں تیز دھوپ میں تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ لوگ اب بھی ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے، سڑک کے کنارے گہری نالیوں میں برف پگھل کر تیز ندیوں کی طرح بہہ رہی تھی ــــــ سڑک کے بائیں طرف نیچے ڈھلوانوں پر پانی زور شور سے شر شر بہہ رہا تھا۔ اور برف کی سفید ریشمی لہریں جگمگا رہی تھیں ــــــ! پگھل رہی تھیں!!

میں تیز دوڑنے لگا۔

کچھ فاصلے پر ڈاک بنگلے کے قریب جیپ کھڑی تھی، اور ڈرائیور ہارن کر رہا تھا ــــــ! شاید وہ مجھے ہی بلا رہے ہیں۔

میں نے غیر شعوری طور پر پتلون کی جیب سے بایاں ہاتھ نکالا، تاکہ وقت دیکھ لوں، لیکن وہاں گھڑی نہ تھی ــــــ"

میں بھاگنے لگا۔

سامنے سے پریم کمار ہاتھ میں سوٹ کیس لئے جا رہے تھے، وہ مجھے دیکھ کر میرے قریب سے یوں گذرے جیسے مجھے مطلق نہ جانتے تھے، اور میں نے بھی کچھ نہ کہا۔

"چلئے بندگی مہاراج ــــــ" بائیں جانب دکان سے وہ ڈرائیور اترا یہ تو ہماری بس کا ڈرائیور تھا، لیکن آج یہ پہچانا نہیں جاتا، اس کے زرد

چہرے پر جیسے ورم آگیا تھا، اس کے پپوٹے اتنے ابھرے ابھرے تھے کہ اس کی آنکھیں ہی نظر نہ آتی تھیں، نہ جانے وہ بیمار تھا بیچارہ یا بیٹے کی شادی کے غم نے اس حال پر پہونچا دیا ہے۔

میں اور آگے بڑھ آیا۔

میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں ——! دائیں جانب پولیس چوکی کو جانے والی سڑک پر غلام محمد اور اسکی بیوی دونوں سر جھکائے ہوئے دو پولیس والوں کے ہمراہ آگے جا رہے تھے ——!

اور سڑک پر انور صاحب، پریم ناتھ، اور سمار چند کھڑے تھے، کچھ اور لوگ بھی وہاں کھڑے تھے، اور وہ جانے والوں کو حسرت سے دیکھ رہے تھے،

"یہ کیا ——؟ یہ غلام محمد اور ان کی بیوی کو کہاں لے جا رہے ہیں؟"
میں بوکھلاہٹ میں چیخ اٹھا، کوئی کچھ نہ بولا، سبھوں نے سر جھکا لیا۔

"آپ بولتے کیوں نہیں؟ —— یہ —— یہ —— آخر معاملہ کیا ہے؟" انور صاحب!"

اور اس کے جواب میں انور صاحب نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا، اور قریب آکر بولے، سرگوشی کرتے ہوئے۔

"یہ آدمی اس عورت کو بھگا کے لایا ہے —— سنا آپ نے؟ بھگا کر لایا ہے!"
میرے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے!

"اور کیا —؟ —— سمار چند بولے" آنکھیں جھپکاتے ہوئے، کلجگ ہے کلجگ ہے!"

مجھے تو پہلے ہی شک ہوا تھا، اس عورت کے طور طریقے ہی عجیب تھے،

"زمانہ ہی خراب ہے بادشاہو" سڑک کے کنارے سردار جی بولے،

"سالی بڑی بدمعاش عورت ہے، پیشہ کرتی ہے۔ سالزادی"، پیچھے سے حیدر ملک نے انکشاف کیا،

"بھائی صاحب، ایسی بات نہیں، یہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہے — ہاں

یہ ضرور ہے، کہ اس آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی ہے" یہ شادی کرنا چاہتی تھی اس کے ساتھ، لیکن گھر والے مانے نہیں ـــــ اور پھر یہ دونوں وہاں سے بھاگ گیئے، انہوں نے اب شادی کر لی ہے"۔

"یہی بات صحیح ہے، باقی سب جھوٹ ہے۔ میں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا، دراصل میں اس حادثے کے لیئے مطلق تیار نہ تھا، اور یہ نظارہ دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا یہ ٹھیک ہے کہ یہ گھر سے بھاگ گیئے ہیں لیکن اس کے ذمہ دار ان کے گھر والے ہیں اور اب ـــــ "اب تو یہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکے ہیں؛ میں نے اتنے دن ان دونوں کو دیکھا تھا، ان کا مطالعہ کیا تھا اور مجھے ان کے کرداروں میں کوئی ایسی ویسی بات نظر نہ آئی تھی ـــــ!

"ہاں ہاں یہ سچی بات ہے ـــــ" بیچارے دونوں میاں بیوی شریف ہیں ـــــ"

"عورت رو رہی تھی بیچاری ـــــ!

"پولیس ان کا کیا بگاڑے گی؟ ان کے پاس نکاح نامہ ہے ـــــ!

"ہارن کی آواز متواتر آ رہی تھی، میں نے سب ساتھیوں سے اجازت چاہی اور جیپ کی طرف گیا، اختر صاحب سگریٹ پھونک رہے تھے، انہوں نے مسکراتے ہوئے میرا سواگت کیا، لیکن میں مسکرا نہ سکا ـــــ!

●

میں فخر اور محبت کے امڈتے ہوئے جذبات جہاز کی سپرنگ والی سیٹ پر بیٹھا، چھوٹی سی کھڑکی کے شیشے سے پیر پنجال اور بانہال کی بلند ترین برف پوش چوٹیوں کو دیکھ رہا تھا ـــــ! آج یہ چوٹیاں میرے زیر پا تھیں! اور میں ہوا میں پرواز کر رہا تھا، میرا سینہ پھولنے لگا ـــــ میری ہر نظر فخر اور مسرت کے جذبات سے چھلک پڑتی تھی" ـــــ اور مجھے دکھائی دے رہا تھا کہ اونچے اونچے وسیع و عریض پہاڑ سمٹ چکے ہیں، ـ اور سمٹ کر چند حقیر ٹیلے اور چند حقیر کھڑے

اور ناہموار لکیریں بن چکے ہیں ——— " یہ حقیر ٹیلے اور ناہموار لکیریں ——!
آج انسان کی پر وقار شخصیت کے مقابلے میں یہ پہاڑ کمزور اور بے حس بونے سے لگ رہے تھے،

یہ پہاڑ طیش میں آکر انسان کے راستوں کو تحس نحس کر دیتے ہیں، یہ پہاڑ وحشی دیوؤں کی طرح چنگھاڑتے ہیں، یہ پہاڑ پھٹ جاتے ہیں، لاوا اگلتے ہیں، پتھر برساتے ہیں، آگ اور دھواں بکھیرتے ہیں، انسان کے عزم و ہمت کو پامال کرنے کے لئے، انسان کو موت کے تاریک غاروں میں دھکیلنے کے لئے، لیکن انسان سخت جان ہے۔ انسان کا عزم کسی صورت میں بھی، انسان کے ہاتھ سے دامن ہمت جانے نہیں دیتا، وہ زخمی ہوتا ہے، لہولہان ہوتا ہے، لیکن اپنی پلکوں پر خوابوں کے چراغ جلاتا ہے اپنے خون جگر کو ارزاں کر کے اس کے ماتھے پر عزم و یقین کی روشنی پھوٹتی ہے، وہ بے مثال وقار اور تمکنت کے ساتھ قدم بڑھاتا ہے —— وہ محنت کی عظمت اور نقوش کو پہچانتا ہے، وہ تعمیر کا پرستار ہے ——!
اور فطرت کی تخریبی قوتوں سے ٹکراتا ہے، شعلے لپکتے ہیں، شعلے برستے ہیں اور انسان آگے بڑھتا ہے، بڑھتا ہی جاتا ہے —— بڑھتا ہی جاتا ہے انسان باد و باراں سے، آندھیوں سے، تلاطم سے، کسی بھی طوفانی قوت سے خائف نہیں ہوتا —— بادل گرجتے ہیں، بجلیاں گرتی ہیں، آبادیاں جلکر خاکستر ہوتی ہیں، راستے دلدل بن جاتے ہیں، بارشوں کے سیلاب اترتے ہیں، فصلیں بہہ جاتی ہیں، برف کے پہاڑ بستیوں کو قبرستان بنا دیتے ہیں، لیکن انسان پھر بھی زندہ رہتا ہے، ان طوفانی قوتوں پر مسکراتا ہے ——" انسان عظیم ہے۔
انسان نے نیچر کی ان بپھری ہوئی طوفانی قوتوں کو مسخر کر لیا ہے! انسان کے چہرے پر فتح مندی کے اجالے مسکراتے ہیں!
اور حیات کی دھنکوں کی مقدس اور شاداب روشنی پھوٹتی ہے ——!

رات کے اندھیروں نے کہاں جا کر منہ چھپا لیا ہے؟ جہاز اور بھی بلندیوں کی طرف جا رہا تھا ـــــ مجھے محسوس ہوا کہ میری گرفت میں وہ لمحے آ گئے ہیں جب بلندیوں کے خواب جاگتے ہیں ـــــ! یہ لمحے کہاں سے آئے تھے؟ انسان کی فکر و نظر نے آخر ان بھاگتے ہوئے لمحوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا ـــــ!

بلندیوں کے خواب جاگ رہے تھے" اور پستیوں کو نیند آ رہی تھی ـــ!

ہم شان اور تمکنت کے ساتھ بانہال کی بلند ترین چوٹی سے گذرے! اور شاخ گل کی طرح لچکتی، مہکتی اور جھومتی، ایر ہوسٹس نے اختر صاحب اور مجھے دونوں کو خوبصورت پیالیوں میں چائے پیش کی۔

میں نے متبسم ہونٹوں سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

اور وہ مسکرائی، جیسے ایک ساتھ بے شمار گلاب کی کلیاں مسکرائی ہوں!

"WONDERFUL" اختر صاحب نے مجھے کہنی ماری۔

لیکن میں پھر باہر کی روشن بلندیوں میں کھو گیا تھا!

یہ جگمگاتی ہوئی بے پایاں وسعتیں ـــــ آج انسان کے دست تصرف میں ہیں ـــــ! اور انسان اب لامحدود خلاؤں تک جانے کیلئے پر پرواز تول رہا ہے۔

اس کی عقابی نگاہوں میں بلندیوں کے خواب جگمگا رہے ہیں۔

انسان چاند کے دیاروں پر جا کر ہی دم لے گا، انسان فطرت کے سربستہ اسرار کی نقاب کشائی کر رہا ہے!

وہ دیکھیے ـــــ وہ دیکھیے نا! ـــــ اختر صاحب نے شیشے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا، میں باہر دیکھنے لگا۔

باہر نیچے پہاڑوں کے لامحدود سلسلے تھے، سمٹے سمٹائے، بے حس و حرکت برف کی منجمد لہریں ـــــ!

"دیکھا آپ نے بانہال کے راستے ——— وہ راستوں کے پیچ وخم؟
دیکھا آپ نے؟"

"ہاں، ہاں دیکھ رہا ہوں ———"

واقعی پہاڑوں کے سلسلوں میں راستوں کے پیچ وخم
ابھر رہے تھے ——— لکیروں کے پیچ وخم!

"اور، وہ دیکھیے، بسیں اور مال گاڑیاں جا رہی ہیں ———"

میں نے غور سے دیکھا، واقعی نیچے راستوں میں بسیں اور گاڑیاں رینگ
رہی تھیں ———!

آج صبح جبکہ ہم نے AERODROME پر جہاز کا انتظار کر رہے
تھے، ہمیں تین روز کے بعد سیٹ ملی تھی، تو پرویز کے اخبار "منزل" کے
پہلے صفحہ پر ہم نے خبر پڑھی ———

بانہال کے پہاڑوں نے آخر کار ہتھیار ڈال دیے، راستے کھل گئے
آج کانوائے بہ جانب سری نگر روانہ ہو رہی ہے ———"

میری مسرتیں انتہائی بلندیوں کو چھو رہی تھیں!

چند منٹوں میں ہم سری نگر کے AERODROM کے ویٹنگ روم میں بیٹھے بس کا
انتظار کر رہے تھے، جس میں مسافروں کا سامان لادا جا رہا تھا،
سبھوں کے چہرے پر مسرت کی لہریں کروٹیں لے رہی تھیں!

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا!

چند منٹوں میں، میں شہر کی مانوس سڑکوں سے گزر کر اپنی جانی پہچانی
گلیوں میں آؤں گا، اور پھر اپنے گھر ———!

میرا دل بے پایاں مسرت سے کانپ رہا تھا،
میری نگاہوں میں بے چینی تھی، میرے سینے میں اضطراب تھا ———!

کاش یہ لمحے پر لگا کر اڑ جاتے!

"______ بھئی، میں بھول ہی گیا ______" اختر صاحب سامنے صوفہ سیٹ پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے، اور باتیں کرتے جاتے تھے، میں بیچ بیچ میں، ہوں ہاں کرتا، میں اس وقت کسی کی باتیں سننے کے موڈ میں نہ تھا، نہ کسی سے ہمکلام ہونے کے لئے تیار تھا ______!

ایک عجیب جذباتی کیفیت تھی یہ تو!

اس جذباتی کیفیت کا کوئی نام نہ تھا!

کتنی یادوں کے پھول کھل رہے تھے!

اور ان کی مہک سے میری سانس گھٹی جا رہی تھی!

جہاز سے اتر کر ہم WAITING ROOM میں بس کا انتظار کر رہے تھے اور سامنے ائیروڈرم کے وسیع اور کھلے احاطے میں اجلی اجلی، شاداب اور حیات بخش دھوپ مسکرا رہی تھی، یہ دھوپ نئی زندگی کی حرارت لے کر آئی تھی، نئی بہاروں کی دھڑکن بن کر۔

اب بہار آرہی ہے!

کیا ہوا اگر برف اور جاڑے نے گلزاروں، مرغزاروں، وادیوں اور جنگلوں کی شادابی اور حسن چھین لیا ہے، کیا ہوا اگر درختوں کی شاخیں اداس ہیں، ننگی اور لٹی لٹی سی، اب بہار آرہی ہے، گلزاروں اور مرغزاروں میں شادابیاں جاگ اٹھیں گی، رعنائیاں اور خوشبوئیں بکھر جائیں گی، مشاطۂ بہار درختوں اور پودوں کے لئے نئے زرکار لباس لائے گی اور یہ رنگ و نور کی دلہنیں پھر دل و نظر کو دیوانہ بنا دینگی ______

"دنظر فل" میں تو بالکل بھول ہی گیا" اختر صاحب اچانک چلائے

"میں ایک شیریں اور گلپوش خواب سے چونک اٹھا۔
میں ان کی طرف گھورنے لگا

اختر صاحب نے جھٹ کوٹ کی اندرونی جیب سے ڈائری نکالی اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے ڈائری سے ایک فوٹو کاپی نکالی، اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"یہ دیکھیے، یہی آپ کی ہونے والی بھابی ہیں"

میں نے با دل نخواستہ فوٹو کاپی ہاتھ میں لے لی۔

سچ بتایئے، پسند آئیں آپ کو؟"

اف، یا اللہ!!

میری نگاہوں میں اندھیرا چھا گیا، پاؤں تلے زمین نکل گئی، مجھے محسوس ہوا جیسے میرا وجود اچانک برف کے ایک تند و تیز، پاگل طوفان کے ساتھ بہہ گیا، اور میں بہت نیچے موت کی تاریک کھائی میں گر گیا۔

میں بڑی مشکل سے سانس لے سکا

یہ رشی تھی، رشی کی تصویر، آپ یقین کیجیے یہ اسی کی تصویر تھی، وہی تیلے سے ہونٹوں کے کانپتے ہوئے خم، وہی چہرے کی تمکنت، وہی پلکوں کی چلمن، وہی بادامی آنکھوں کی معصومیت اور ذہانت، وہی لہراتے ہوئے بال ــــ یہ نورشی تھی، جس کی تصویر میرے دل میں نقش تھی، ــــ"

اسی تصویر کی ایک کاپی میرے پاس بھی موجود تھی، جو میری اٹیچی میں محفوظ تھی، اور یہ کاپی ــــ اف میرے معبود!

"کہیے پسند آئیں آپ کو؟" اختر صاحب نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔

"جی ــــ جی ــــ ہاں!"

میں نے اپنے حواس پر قابو رکھنے کی تمام تر کوشش کی ——

پان، پان، پان ——!

اتنے میں بس نے تیزی سے ہارن بجایا، مسافر چیزیں لے کر دوڑنے لگے، بس کے گرد مسافروں کا ہجوم کھڑا ہو گیا، اختر نے جلدی سے فوٹو ڈائری میں رکھا، ڈائری جیب میں ٹھونس دی، اور ہینڈ بیگ لے کر دوڑنے لگا،

"چلو بھئی، HURRY UP" وہ مجھ سے آگے نکل گیا،

سراسیمگی میں، میں بھی قدم اٹھانے لگا

لیکن میں کہاں جا رہا تھا!

میرے سامنے تاریکیاں ہی تاریکیاں تھیں، لامحدود تاریکیاں، پستیاں، مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں روشن بلندیوں سے تاریک پستیوں میں اوندھے منہ گرتا جا رہا ہوں ——!!